٤ 1959

(3)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وممن خلقنا امة یهدون بالحق وبه یعدلون

(قرآن کریم ۔ سورہ اعراف)

المنار

تعلیم الاسلام کالج ۔ ربوہ

○

نگران

شیخ محبوب عالم خالد ایم۔اے

○

ادارہ تحریر

لطف الرحمن محمود

سلیم اختر صدیقی

مہر اللہ یار

○

جلد ۵ ـــــــ جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۹ء ـــــــ شمارہ ۳-۴

جھلک

مستقل کالم :- برسبیلِ تذکرہ .. ..

نقد و نظر .. ..

تبرکات :- محمدؐ ہست برہانِ محمدؐ .. ..

حضرت بانیٔ جماعتِ احمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

مقالات و مضامین :- (اسلامیات) ثقافتِ اسلامیہ ——— سلیم اختر صدیقی

(سائنس) چاند کی سیر ——— لطف الرحمٰن محمود

(تاریخ) دُنیا کا سب سے پہلا کتب خانہ ——— حمید احمدؐ

(ادبیات) اقبال کا اردو شاعری میں مرتبہ ——— محمد الیاس سلیمی

افکارِ عالیہ :- "...... معلوم نہ تھا" ——— خان نصیر احمد خان ایم ایس سی

رقصِ فطرت :- "گھٹیالیاں کا ایک منظر" ——— عبدالسلام اختر ایم اے

کیف و رنگ :- "دل عجب شہر ہے خیالوں کا" ——— سمیع اللہ - ایم اے

"دُور کہیں" ——— کے - کے کرشن

یادِ رفتگان :- "ایک نام" ——— صاحبزادہ معتصم کفایت اللہ مرحوم

غزلیں :- رسا - خلیل - یونس - محمود

افسانے :- "فسادات" ——— یحییٰ فضلی

"انجام" ——— کلیم اللہ

طنز و مزاح :- گر تو بُرا نہ مانے .. ..

اعلیٰ حضرت ——— حفاظت احمدؐ

آدمی اور قسمت ——— مبشر احمد طاہر

متفرقات :- ایک آواز ——— مہر اللہ یار

لطائف ——— کریم اللہ خان

انتخابِ افکار ——— ادارہ

تبرکات

محمدؐ ہست برہانِ محمدؐ

(حضرت بانی جماعت احمدیہ علیہ السلام)

عجب نوریست در جانِ محمدؐ — عجب لعلیست در کانِ محمدؐ
ندانم ہیچ نفسے در دو عالم — کہ دارد شوکت و شانِ محمدؐ
اگر خواہی نجات از ہستیٔ نفس — بیاور در ذیلِ مستانِ محمدؐ
اگر خواہی کہ حق گوید ثنایت — بشو از دل ثنا خوانِ محمدؐ
اگر خواہی دلیلے عاشقش باش — محمدؐ ہست برہانِ محمدؐ
سرے دارم فدائے خاکِ احمدؐ — دلم ہر وقت قربانِ محمدؐ
بے سہلست از دنیا بریدن — بیادِ حسن و احسانِ محمدؐ
فدا شد در رہش ہر ذرۂ من — کہ دیدم حسنِ پنہانِ محمدؐ
دگر استاد را نامے ندانم — کہ خواندم در دبستانِ محمدؐ
بدیگر دلبرے کارے ندارم — کہ ہستم کشتۂ آنِ محمدؐ
مرا آں گوشۂ چشمے بیاید — نخواہم جز گلستانِ محمدؐ
من آں خوش مرغ از مرغانِ قدسم — کہ دارد جا بہ بستانِ محمدؐ
تو جانِ ما منوّر کردی از عشق — فدایت جانم اے جانِ محمدؐ
دریغا گر دہم صد جان دریں راہ — نباشد نیز شایانِ محمدؐ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ

(درثمین)

بر سبیلِ تذکرہ

● المنار کا تازہ شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ دسمبر ۵۸ء میں جو شمارہ پیش کیا گیا تھا وہ اپنی معنوی خصوصیات کی وجہ سے جتنا بلند پایہ تھا، بدقسمتی سے صوری لحاظ سے اُتنا ہی ناقص اور ناکام ثابت ہوا۔ غیر معیاری کتابت اور طباعت یقیناً طبعِ نازک پر گراں گزری ہوگی۔ زیرِ نظر شمارہ میں اس کی نہ صرف تلافی کی گئی ہے بلکہ معنوی اور صوری دونوں لحاظ سے جریدہ کا معیار برقرار رکھنے بلکہ بلند کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

● مگر اِس شمارہ کو منصہٴ شہود پر لانے کے لئے جن مشکلات اور مصائب کا سامنا ہمیں کرنا پڑا ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم یہی عرض کریں گے کہ سب سے بڑی رکاوٹ اور لاینحل مشکل تو آپ کی سنگین بے التفاتی ہی ہے۔ فنون (آرٹس) کے طلبہ کو اِس سلسلہ میں زیادہ سرگرمی اور جوش و خروش کا مظاہرہ کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ سائنس کے اکثر طلبہ شدید مصروفیت کی وجہ سے اِس کارِ خیر میں حصہ لینے سے محروم رہتے ہیں۔ مگر المنار کے گزشتہ سے پیوستہ شمارے شاہد ہیں کہ سائنس کے طلبہ نے ہی جریدہ کی زیادہ قلمی اعانت کی ہے جس کے لئے ہم اُن کے مشکور ہیں۔ آرٹس کے طلبہ کی مہلک بے اعتنائی، حیران کُن سکوت اور افسوسناک جمود کے باوجود المنار کا باقاعدہ شائع ہوتے رہنا ہی ایک ایسا معجزہ ہے جسے حقیقت بین نگاہ جھٹلا نہیں سکتی!

● طلبہ کی طرف سے بروقت موصول ہونے والی تمام بلند پایہ نگارشات کو شریکِ اشاعت کیا گیا ہے۔ بعض نئے لکھنے والوں کی تخلیقات بھی حوصلہ افزائی کی نیت سے شامل کی گئی ہیں۔ جو کچھ ہمیں ملتا ہے اُس سے بڑی مشکل سے اِن صفحات کا پیٹ بھرتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں انتخاب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ بہر حال حجم کا دارومدار حاصل شدہ مواد کی "کیفیت" اور "کمیت" پر ہی ہے ——— اور یہی وہ چیز ہے جس کی نایابی اور قلت کا رونا ہم ہر بار روتے ہیں۔ اِن نامساعد حالات میں ناپختگی پر مُنہ بسورنا اور سطحیت پر شکوہ سنج ہونا محترم نقاد کو زیب نہیں دیتا۔

● ہم نے اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کی ہے کہ زیرِ نظر شمارہ ہر لحاظ سے دلچسپ اور جاذبِ نظر ہو۔ اب اگر آپ کی نگاہِ التفات اِسے حقارت سے نہ ٹھکرائے تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری مخلصانہ کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔ جریدہ آپ ہی کی تخلیقات کا مرقع ہے۔ اگر یہ معیاری ہے تو آپ ہی داد کے مستحق ہیں اور اگر غیر معیاری ہے تو اس کے اصل ذمہ دار آپ ہی ہیں۔ کیونکہ کسی کالج کے جریدہ کے غیر معیاری ہونے کی ذمہ داری اُن طلبہ پر ہی عائد ہوتی ہے جن کی ذہنی استعدادوں اور فنی صلاحیتوں کے بھروسہ پر اُسے جاری کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے غیر معیاری ہونے کے ذمہ دار وہ اساتذہ کرام ہیں جن کی مصروفیات اُن کے دستِ مروّت کو مجروح کر دیتی ہیں اور وہ اپنے عزیز شاگردوں ——— جو اُن کے علم و کمال سے استفادہ کے سب سے زیادہ مستحق ہوتے ہیں ——— کے لئے ذہنی جلا کا سامان مہیا کرنے کے عظیم فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوتے ——— ہمارا تو یہی ایمان ہے کہ حقیقی علم و فضل وہی ہے جس کی عام افادیت کا دائرہ عمل وسیع تر ہو!

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے ٭ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جائینگے

لطف الرحمٰن محمود

"سیلانی"

نقد و نظر

○ امتحانات :- لیجئے صاحب موسم سرما آ کر گزر رہا ہے ـــــ لیکن ہمارے دیس میں یہ موسم چپکے سے نہیں گزر جاتا بلکہ کچھ ایسی ناز آفریں انگڑائیاں لیتا ہے کہ توبہ ہی بھلی ـــــ ایک انگڑائی میں تو خدا جانے کیا کچھ بھرا ہے کہ کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں ـــــ اسی موسم میں ایک دن ایسا بھی آتا ہے کہ اشفاق روم کے آس پاس گھوم کر کئی نیک دل بزرگ تو سورۂ یٰسین پڑھ کر پھونکا کرتے ہیں !! ہاں آپ بالکل بجا سمجھے کہ ٹیسٹوں کا موسم ہے! یوں تو جاڑے کی آمد کے ساتھ ہی ٹسٹ شروع ہو جاتے ہیں مگر ان سب میں دسمبر ٹسٹ "سنگ میل" کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کنڈیشن لگنے کی دیر ہے بس وہی معاملہ ہو جاتا ہے "بڑھیا مری تو مری فرشتوں نے گھر دیکھ لیا"۔ یہ کنڈیشن آئندہ کسی بڑے حادثے کا پیش خیمہ بن جاتی ہے ـــــ یعنی بورڈ یا یونیورسٹی کے امتحانوں میں خیمہ لگانے کی اجازت نہیں دی جاتی ـــــ بلکہ طالب علم کو مہاجر بنا دیا جاتا ہے اور اگلے سال کی "آبادکاری" تک انتظار کرنا رہتا ہے۔ خیر سیلانی کا مقصد مردم شماری نہیں کچھ اور ہے ـــــ

یہ دسمبر ہے۔ مرغن غذاؤں سے چہرے پر جو جوانی چھائی تھی وہ تو دسمبر ٹسٹ کے پرچوں کی نذر ہو گئی۔ گالوں کی سُرخی پرچوں کی سرخیوں میں گئی! سنجیدگی، اضمحلال اور پژمردگی نے اپنے مہیب پر پھیلا لئے۔ کچھ مغموم چہرے بھی ہیں اور کچھ نیم مغموم بھی سیلانی کئی ایسے حضرات سے ملا۔ اجی۔ استغفراللہ۔ ملا کیا، بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ پھونکا۔ یا اللہ تو نے بڑی عجیب مخلوقات پیدا کی ہے مگر کتابی کیڑوں کی مخلوق کے کیا کہنے! ان کے دم قدم سے آشرم (یتیم خانہ) بن جاتا ہے۔ ہر فرد آٹھ پہر روگی ہے۔ اور کسی کی آتما خدا جانے کبھی ٹھنڈی بھی ہوتی ہے یا نہیں!

ایسا ہی ایک مسکین پرچہ حل کرنے کے بعد ہال کے باہر رنگ آیا تھا ـــــ یہ سماں دیکھ سیلانی کا ماتھا ٹھنکا۔ کہ یہ تو بی گلہری کے رنگ لانے کا موسم ہے۔ اُن سے اس اُداسی کا مطلب پوچھا ـــــ جواب ملا "صاحب! بات یہ ہے کہ پرچہ خراب ہوا ہے"۔ یہ سُن کر سیلانی کی باچھیں کھل گئیں اور کان کھڑے ہو گئے کہ پرچہ بھی اُن حضرت کا اور وہ بھی خراب؟ از راہِ ہمدردی دریافت کیا کہ ذرا خرابی تو بتاؤ ـــــ گویا ہوئے "فقط سوال کے بی پارٹ میں دو نمبر کا جز رہ گیا ہے"۔ یہ سُن کر مارے غصے کے سیلانی کے تن بدن پر برماشیل کا پٹرول پڑ گیا۔ ـــــ جی چاہا کہ ان حضرت کی ہڈی پسلی ایک کر کے ثوابِ دارین حاصل کرنا چاہیے۔ مگر افسوس کہ یہ توفیق نہ ہوئی۔!

قارئین! ناشکری میں اس قوم کی مثال بنی اسرائیل ہی ہو سکتے ہیں!۔ عادت کے متعلق بڑے کہتے ہیں کہ جان کے ساتھ آتی ہے اور جنازے کے ساتھ جاتی ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ یہ عادت اب کیا رنگ لاتی ہے؟

سیلانی یہاں ایک بات ضرور کہنا چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کورے طلبہ کی اُمتِ مرحومہ میں لاریب کوئی خوبی نہیں مگر وہ اس حقیقت پر ضرور ایمان رکھتے ہیں "آپ زندہ جہاں زندہ" وہ کم از کم شاکر و صابر ضرور ہیں!۔ اور اس کے برعکس یہ حضرات ہیں کہ دو نمبروں کے ضیاع سے ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں اور اس وقت تک اُن کی تسلی نہیں ہوتی جب تک کہ ایک اچھی خاصی "مجلس عزا" کا اہتمام نہ کر لیں اور تعزیتی وفود کا تانتا نہ بندھ جائے۔!!

○ پروفیسر بارطولیبی کی آمد :- ایک اطالوی سپاہی تھے۔ جنگ عظیم کے دوران میں گرفتار ہو کر اور یہ اسیری سیلانی یونیورسٹی کی پروفیسری کا پیش خیمہ بن گئی۔ وہ اس طرح کہ جنگی قیدی کی حیثیت میں یہاں لائے گئے۔ مگر اُردو کی شیرینی نے انہیں یہ زبان سیکھنے پر مجبور کر دیا۔ انگریزوں کی پابندیوں کے باوجود آپ اُردو زبان سیکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ آپ نے اُردو میں اپنی تقریر کے دوران میں انہیں

نو خیدہ کوششوں کا نقشہ کھینچا ——

سچ ہے کہ گھر کی مرغی دال برابر —— بیرونی لوگوں کو جب اپنی زبانیں بولنی پڑتی ہیں اور اُن کے منہ جیومیٹری کی مختلف اشکال؛ دائرے، مربعے، مثلثیں مستطیلیں اور قوسیں وغیرہ بناتے ہیں تو وہ گھبرا کر اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے اُردو سیکھتے ہیں۔ اور ہم لوگ ہیں کہ عملی طور پر اپنی زبان کی صلاحیتوں کے منکر ہیں۔ اور یہ اسی ناقدری کی سزا ہے جو ہمیں ہر سال ہزاروں طلبہ کے جنازوں کے جلوس کی شکل میں ملتی ہے۔ وہی بات ہے —— آپ آپ کو مر گئے اور سرہانے دھرا رہا پانی !!

خیر یہ تو برسبیل تذکرہ تھا۔ آپ نے تقریر کے بعد اطالوی نظموں کا اُردو میں ترجمہ سنا کر خراجِ تحسین وصول فرمایا۔ اس کے بعد طلبہ آٹوگراف پر ٹوٹ پڑے۔ مگر کیا کسی کے پاس کوئی باقاعدہ "آٹوگراف بُک" بھی تھی؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ایک صاحب نے ریاضی کی کاپی پر آٹوگراف لے لئے۔ دوسرے نے فزکس کی کاپی ہی سامنے کر دی۔ تیسرے نے کیمسٹری کے فارمولوں پر ایک نیا فارمولا بنوا لیا —— اور ایک صاحب نے تو حد ہی کر دی کہ پریکٹیکل کی کاپی ہی کھول کر سامنے کر دی —— اب اس پر کوئی کیا آٹوگراف دیتا! اسے ذوق کہتے ہیں !! ع

باز آئے اس بلندیٔ ذوقِ نظر سے ہم

○ **مباحثے** :- ایک دو مباحثے بھی ہوئے ہیں۔ ایک میں قرارداد زیرِ بحث تھی کہ "اس ایوان کی رائے میں غربت تمام جرائم کی جڑ ہے"۔ ظاہر ہے بڑا چکنے دار موضوع تھا۔ مگر یہاں کسی کو چکنے دار یا غیر چکنے دار سے کیا غرض۔ یہاں تو بس موضوع چاہیئے۔ یوں تو مقرر گھر اور باہر یعنی دوسرے اداروں سے بھی آئے۔ مگر کیا کوئی اپنے ساتھ دلیل بھی لایا؟ —— بھلا دلیل بھی تقریر میں کوئی دینے کی چیز ہے! کوئی قرض لینا ہے جو دلیل مانگتے ہو؟ تقریر کرنا جانتے ہیں دلیل دینا نہیں۔

ایک پٹری قسم کے مقرر ہیں۔ ہیں تو ہمارے کالج ہی کی پیداوار مگر ہیں فصلِ خریف۔ اپنے آپ کو شاخِ زعفران سمجھتے ہیں۔ کوئی مباحثہ ہو اور کہیں ہو —— یہ صاحب وہاں ضرور چہکتے ہیں۔ تقریر سے پہلے تین دن "میک اپ" پر صرف کرنا ان کی سنّت ہے۔ تصنع ان کی فطرت میں روزِ اوّل سے ودیعت ہے۔ ودیعت کیا اللہ میاں سے مانگ کر لائے ہیں۔ منطق کے زور سے ہر وقت آسمان میں تھگلی لگانے کے مدعی ہیں۔ یہاں بھی حسبِ معمول آئے اور اسٹیج پر بڑے ٹھسے سے اُن کی "سواری" آئی۔ مگر بڑے کہہ گئے ہیں "کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربہ"۔ شوربہ تو خیر بن گیا تھا مگر اُن سے کوئی پوچھے کہ جنگل کی چوبِ خشک سے کونسے گھرندا بناتے پھرتے ہو؟ تقریر میں کچھ غیر ملکی زبانیں بولنے لگے۔ سارا ایوان سہم گیا کہ ابھی تو اچھے بھلے تھے اِن کو کیا ہو گیا ہے —— "بھئی یہ تو عجائب گھر میں رکھنے کی چیز ہے"۔ سیلانی کو کہنی مار کر کسی نے مخاطب کیا۔

○ **غیر ملکی اصحاب** :- عجیب و غریب جگر دوز گیسوں سے اپنے اچھے بھلے پھیپھڑوں کو خراب کرنے کی نیت سے حسبِ معمول سیلانی خوشی خوشی کیمیا کے دار التجربہ میں جا رہا تھا۔ کیا خبر تھی کہ تکہ کے راستے میں بند بیٹھے ہیں کسی نے بتایا کہ آج مبلغ ایک درجن غیر ملکی اصحاب اپنے اپنے ملکوں کا تعارف کرانے کے لئے آ رہے ہیں۔ اب تو سیلانی کی نیت خراب ہو گئی۔ اِدھر دماغ روشن ہونا تھا اور اُدھر پھیپھڑے خراب۔ فیصلہ تو آسان تھا مگر اُدھر محترم خان صاحب تھے جن کے متعلق مشہور ہے ایسی تقریبات پر رخصتِ عام دینا اُن کے لئے ناممکنات میں سے ہے۔ خدا خدا کر کے جناب مرزا صاحب نظر پڑے۔ وہی نا مجلس عمومی کے نائب صدر۔ سیلانی اُن کے حضور رویا دھویا۔ انہوں نے آ کر ہم سب کی شفاعت فرمائی۔ اُن کی رقّت انگیزی سے محترم خان صاحب کا دل بھی پسیج ہی گیا۔ اور رخصت کا اعلان ہو گیا۔ مگر افسوس کہ بکری نے دودھ تو دیا مگر مینگنیوں بھرا۔ وہ اس طرح کہ کئی "منافقین" نے جو پہلے چھٹی پر مصر تھے "H_2S" سے فرقت گوارا کرنی پسند نہ کی اور فیصلے پر نظرِ ثانی کرا نہ آئے —— کانوں کان سیلانی کو خبر ہو گئی —— آئی پر کب چوکنے والے تھے۔ چنانچہ ان بگلا بھگتوں کی کچھ پیش نہ چلی اور تقریب سے محظوظ رہنے والے اس سے محظوظ ہونے کے لئے

بھیگی بلیاں بن کر اگلے پنجوں پر آ بیٹھے ۔ اسے کہتے ہیں ——
"مجبوری کا نام شکریہ" !!

افریقہ اور یورپ کے کالے اور گورے باہم مل بیٹھے دوسرے نمائندوں نے تو اپنے اپنے ملکوں کی خوبیاں بیان کیں مگر اپنا نمائندہ تو بہت ہی سادہ تھا۔ سیلانی تو کہے گا کہ ان حضرت کو اخلاص زور کر گیا تھا۔ وہی نا اپنے حبیب ردّ صاحب، جن کے متعلق مشہور ہے کہ ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مگر اپنے ملک کا درد دل میں بھی نہیں۔ ورنہ یہ کیوں کہتے کہ ہمارا ملک بڑا کنگال ہے اور جہالت کا گہوارہ ہے! ۔ اچھا جہالت کا گہوارہ ہے، یہ سارے غیر ملکی آخر کس لئے آتے ہیں؟ کیا اکتسابِ علم کے لئے نہیں آتے۔ مقررین میں کینیا کے جمل غوری صاحب کا اندازِ خطابت انتہائی دلکش تھا۔ باقی سیلانی سارا افسوس اپنے نمائندے پر خرچ کرتا ہے کیونکہ "اوّل خویش بعدہٗ درویش"۔

نصرت علوی صاحب کے سوالات کی تعداد مقرر کی تقریر کے فقرات سے زیادہ ہوتی تھی۔ وہ کچھ اس انداز سے سوال کرتے تھے کہ جناب داغ مرحوم کا شاگرد رشید یاد آجاتا جنکے شاعرانہ دردِ زہ "کو محسوس کر کے داغ مرحوم فرمایا کرتے تھے "یہ صاحب شعر کہتے نہیں بلکہ شعر جنتے ہیں"۔

○ **مجلس مذاکرہ** :۔ دسمبر کے ابتدائی ایام میں مجلس عمومی نے ایک مجلس مذاکرہ کا انعقاد کیا۔ جس میں اسلامی اور دیگر علمی موضوعات پر مقالات پڑھے گئے۔ نہایت کامیاب تقریب تھی۔ سیلانی کو سارے اجلاس میں کوئی اجنبیت محسوس نہ ہوئی البتہ ایک حیرانی نے آگھیرا، وہ یہ کہ اس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر خواجہ نذیر احمد صاحب ظفر "اسلام اور ہومیوپیتھی" پر مقالہ پڑھیں گے مگر ایسا نہ ہوا —— ویسے اس جدّت طرازی پر سیلانی اربابِ بست و کشاد کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

○ **شادی خانہ آبادی** :۔ مجلس مذاکرہ پر چند سطور لکھنے کے بعد سیلانی عملی طور پر اپنا کالم بند کر کے کسی اور ہی بات کا تعاقب کر رہا تھا کہ اچانک اپنے شفیق اساتذہ کی نوزائیدہ مسرتوں کا خیال آیا۔ اور وہ اس طرح کہ سامنے سے مسٹر شادی گزرا اور بیٹھے بٹھائے نوبت ان سطور تک آگئی۔ پہلے سیلانی کو یہ خیال آیا کہ عروسی تقریبات کا کالج کی سرگرمیوں سے کیا تعلق ہے؟ ۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد سیلانی نے ان بیچ میں ٹانگ اڑانا اپنے خاموش وقار کے منافی سمجھا۔ بعد ازاں اساتذہ کرام سے اپنی دلی عقیدت نے اُسے ان سطور کے لکھنے پر مجبور کر دیا۔ مرزا خورشید احمد صاحب کی شادی خانہ آبادی کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس کے علاوہ دو اور شفیق اساتذہ —— رفیق احمد صاحب ثاقب اور رشید غنی صاحب نے صرف نکاح پر ہی اکتفا کیا ہے۔ سیلانی ان حضرات سے کوئی خبر و خیر نہیں مانگتا بلکہ ان کی خدمت میں صمیم قلب سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔ ع

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

سیلانی اپنی حالتِ زار بیان کر چکا ہے کہ کالم عملی طور پر تو ختم کیا جا چکا تھا مگر بعد ازاں مجبوراً اس قفلِ سکوت کو توڑنا پڑا۔ اب یہ بند کچھ ایسا ٹوٹا ہے کہ جڑائے نہ بنے! مسودہ تو پریس جانے والا تھا مگر ایک دو واقعات ایسے رونما ہو گئے ہیں کہ اگر ان پر توپ نہ کھولی تو یار لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ آخر کالم ہی لکھا ہے نا کسی قاضی کی گدی تو نہیں چھن جاتی! ڈر تو کوئی نہیں البتہ ایک فکر دامنگیر ہے کہ یہ شیطان کی آنت لمبی ہی ہوتی جاتی ہے اور لطف گھٹتا جاتا ہے!!

○ **بازگشت** :۔ یادش بخیر مباحثوں کا زمانہ آگیا۔ ٹسٹوں کے موسم کے گزرنے کے بعد مباحثوں کی سُہانی رُت آتی ہے ایسے ہی جیسے روزوں کے بعد عید کے لمحات آتے ہیں۔ خیر اس بہار کے موسم کا یہاں بھی اثر ہوا ہے۔ سالانہ مباحثوں کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ اپنے نوخیز مقررین نے بھی اب پر پُرزے نکالنے شروع کئے ہیں۔ ادھر ادھر گھوم کر پاکستان کے شہروں کو (باقی صفحہ پر)

خان نصیر احمد خان
ایم۔ ایس۔ سی

مجھے معلوم نہ تھا

جیتے جی جان سے جانا مجھے معلوم نہ تھا
موت ہے دل کا لگانا مجھے معلوم نہ تھا

پھیر لیں آج تو اپنوں نے بھی آنکھیں ہم سے
یوں بدلتا ہے زمانا مجھے معلوم نہ تھا

عمر اِک برقِ گریزاں کے سوا کچھ بھی نہیں
عیش دُنیا ہے فسانا مجھے معلوم نہ تھا

قولِ حق میں تو سرِ دار بھی کہہ دیتا ہوں
مصلحت میں ہے زمانا مجھے معلوم نہ تھا

لب بھی ہرگز نہ ہلیں آنکھ بھی وا ہو نہ سکے
یوں بھری بزم سے جانا مجھے معلوم نہ تھا

جب تلک دیکھا نہ تھا رُوٹھ کے من جانا ترا
جان میں جان کا آنا مجھے معلوم نہ تھا

زندگی خوابِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں
موت ہے ہوش میں آنا مجھے معلوم نہ تھا

مرحبا تیرے ہر اک شعر کے شیشے میں نصیرؔ
یوں پری کا اُتر آنا مجھے معلوم نہ تھا

سلیم اختر صدیقی

ثقافتِ اسلامیہ

(قسط اوّل)

(جناب خلیفہ صلاح الدین احمدؒ کی تصنیف "اسلامک کلچر" کے چند اقتباسات کا عکس)

لفظ کلچر ہمیشہ سے زیرِ بحث رہا ہے اور آج تک کوئی بھی اس کی خاطر خواہ تصریح پیش نہ کر سکا۔ اور اِس لفظ کی تعریف بھی دراصل کافی مشکل ہے۔ کیونکہ فی زمانہ ہمیں کوئی بھی تو ایسا کلچر نظر نہیں آتا ہے کہ جس پر انسانیت اور خوشحال سوشل زندگی کا دار و مدار ہو۔ اور اِس امر سے بھی کسی کو انکار نہیں ہے کہ یہ کلچر ہی تو ہے کہ جس نے ہمیں خاندانوں، قبائل اور مختلف الانواع اقوام میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اور اگر ہم اس قسم کی بنیادی ضروریات سے محروم کر دیئے جائیں تو یہ ایک بہت قابلِ افسوس امر ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا اِس وقت ایک بین الاقوامی بے چینی میں مبتلا ہے۔ کیونکہ انہیں وہ بُنیادی امور احسن و اکمل طور پر میسّر نہیں ہیں۔ تاہم مشہور فلسفی برٹرنڈ رسل نے مندرجہ ذیل الفاظ میں تصویر کھینچی ہے:۔

"یہ اختلاف یونان میں اُن کے فلسفہ کی تخلیق سے پہلے کا موجود تھا۔ اور آج بھی یونانی فلسفہ میں یہ امر صاف اور مشرح طور پر درج ہے۔ اور مختلف رُوپ دھارتا ہوا آج بھی ہمارے ایام میں نظر آتا ہے اور بغیر شک و شبہ آئندہ نامعلوم مدت تک رہے گا۔"

"اور یہ امر بھی صاف ہے کہ ہر ایک کو اِس بحث سے کسی نہ کسی طور پر اختلاف ہے ــــ اور یہ اختلاف کچھ غلط اور کچھ صحیح بنیادوں پر قائم ہے۔ اور اس کے لئے سوشل لگاؤ کا ہونا ضروری ہے۔ اور انسانیت آج تک اِس قسم کا لگاؤ صرف عقلی دلائل سے قائم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ عموماً پُرانی تہذیبیں ناہموار اور دقیانوسی خیالات سے شروع ہوتی ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ بتدریج اس میں کمی واقع ہوتی چلی جاتی ہے اور آخرکار ایک عقل و فہم کا مقام آجاتا ہے۔ جبکہ پُرانی معقول روایات قائم رہتی ہیں اور غیر معقول خیالات جن میں کہ اب تک کوئی ارتقاء واقع نہیں ہوتا ہے معدوم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب بُرائیاں کھلے بندوں ظاہر ہونے لگتی ہیں تو بغیر کسی شک کے بے چینی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور نتیجۃً نئے قسم کے ظلم و تشدد کی داغ بیل نکلتی ہے۔ اور اس کا حل پیش کرنے کے لئے نئے اصول لے کر ایک نیا نظام جنم لیتا ہے۔" (مغربی فلسفہ کی تاریخ صـ ۲۰)

پس موجودہ بے چینی اور اختلاف ایک لمبے عرصہ کی بے راہروی

خیالات کی ناہمواری کا نتیجہ ہے کہ جسے رسل نے "ناہموار اور توہماتی نظام" سے تعبیر کیا ہے۔ خاص طور پر اس کا مطلب مذہبی دور سے ہے۔ کیونکہ وہ مذہبی نظام کو ہی تو ناہموار اور مذہبی عقائد کو توہمات سے تعبیر کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج تک کوئی ایسی قوم نہیں ہوئی ہے اور نہ ہے کہ جس کی بنیاد مذہب پر نہ ہو۔ کیونکہ مذہب ہی تو وہ بنیادی نقطہ ہے کہ جس پر مضبوط اور شاندار اجتماعیت کا دارومدار ہے۔ اور انسانیت گروہ در گروہ اس ہم طبع سوسائٹی میں پرو دی جاتی ہے۔ اور ہر شیطانی حربہ اسے منتشر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اور مذہب کا ہی یہ وہ مقام ہے کہ جسے رسل نے عقل و فہم کا مقام کہا ہے۔ جو کہ بُرائیوں اور ظلم و تشدد کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس قسم کی تمام چیزوں کو مٹا دیتا ہے جس کے نتیجہ میں رسل نے کہا ہے کہ "بیسویں صدی کی موجودہ تہذیب نے دنیا کو ایک نئے قسم کے ظلم و تشدد میں مبتلا کر رکھا ہے۔" اور رسل نے ان امور کے حل کے لئے کہا ہے کہ ان چیزوں کے نتیجہ کے طور پر یہ خود بخود "ایک نیا نظام نئے اصولوں کے ساتھ جنم لیتا ہے۔" یہ نیا نظام جو کہ نئے اصول لیکر پیدا ہوتا ہے وہ مذہب ہے لیکن اس بات کی پردہ پوشی کرنے کے لئے اور احیائے مذہب کے نئے دور کو پس پردہ کرنے کے لئے وہ مزید تشریحاً کچھ الفاظ بڑھاتا ہے۔ "نظریۂ حُرّیت اس مستقل بے چینی سے بچنے کی ایک کوشش ہے۔ اور کیا یہ کوشش کامیاب رہے گی؟ اس کا فیصلہ آئندہ آنے والے ایام ہی کر سکتے ہیں۔" بر ٹرنڈ رسل نے مذہب کی جگہ نظریۂ حُرّیت کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

اسی طرح ٹائنبی نے بھی موجودہ بے چینی کے دور کو "تہذیب امتحان کے پلڑا میں" سے تعبیر کیا ہے۔ اور موجودہ حالت سے وہ بھی مطمئن نظر نہیں آتا ہے کہ اُس نے مزید یہ بھی کہا ہے کہ ہماری تہذیب ایک ایسے نقطہ پر پہنچ چکی ہے کہ جس پر یہ از خود تباہ ہو کے رہ جائے گی۔ اور نتیجۃً اس کے بعد مذہبی دور کا آغاز ہوگا۔

ان حالات میں ہم "اسلامی کلچر" سے مراد آئندہ دور کا آنے والا کلچر لے سکتے ہیں۔ اور ہمارا یہ دعویٰ اس لئے ہے کہ کلچر کی ترقی پذیر ترتیب اسلام پیش کرتا ہے جو کہ آخری اور مکمل ضابطۂ حیات ہے اور جسے انسانیت کی خاطر خدا تعالیٰ نے اُتارا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ "آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور میری رضا مندی نے تمہارے لئے مذہب اسلام کو چنا ہے۔"

لیکن اسلامی کلچر کسی ناہموار اور توہماتی نظام کا بانی نہیں ہے جیسا کہ رسل کو خوف درپیش ہے۔ لیکن رسل کو یہ جان لینا چاہیئے کہ اسلام ایک ایسا قابلِ قبول نظریہ جو کہ توہماتی خیالات سے آزاد ہو پیش کریگا اور جسے آج تک انسانیت اپنے خواب میں بھی نہ لا سکی۔ یہ نظریہ صرف نظریہ ہی نہ ہوگا بلکہ قابلِ عمل بھی ہوگا۔ اور اس نظریہ کو منوانے کے لئے جبر بھی نہیں کیا جائے گا بلکہ خود اس میں ایسی خوبصورتی ہوگی کہ انسانیت اپنے امن کی خاطر خود بخود اس کو قبول کر لے گی۔ اور یہ دعویٰ میرا اپنی طرف سے نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ "مذہب کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے"۔ مذہب سے مراد مذہب اسلام ہے۔ "تاکہ اُن لوگوں کو تباہ ہونے دو جو کہ اپنی دلیل سے تباہ ہوتے ہیں اور اُن لوگوں کو زندگی حاصل کرنے دو جو کہ اپنی دلیل سے زندہ ہوتے ہیں۔" اسی طرح اسلام صرف نظریہ ہی نہیں پیش کرتا بلکہ اپنے دعویٰ کی دلیل بھی پیش کرتا ہے تاکہ ہر ایک اپنی عقل سے جانچ کر اسے قبول کرے۔ اس لئے اسلام کوئی ایسا کلچر بھی نہیں پیش کرتا جو کہ لوگوں پر زبردستی مسلط کر دیا جائے اور نہ ہی کوئی ایسا ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے جو انسانی عقل سے بالا ہو۔ اور موجودہ یا آئندہ آنے والے دور کی نسل اُسے سمجھنے سے قاصر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی کلچر سے ہماری مراد ایک ایسا سوشل نظام ہے جو کہ انسانی عقل کے عین مطابق ہے۔

اور اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اسلامی کلچر سے ہماری مراد وہ نہیں ہے جو کہ عموماً موجودہ دور کے صاحبِ فکر لوگ لیتے ہیں بلکہ اسلامی کلچر ایک ایسی چیز ہے جو کہ موجودہ

دور کے لوگوں کے لئے قابلِ عمل ہے۔

اس سے پہلے کہ میں اسلامی کلچر کے متعلق کچھ لکھوں میں ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس کے لئے ایک عام اور قابلِ قبول اصول وضع کر لیا جائے۔ جس کی وجہ سے بحث آسان ہو جائے گی۔ اور اس طرح سے ہم اسلامی کلچر اور دوسرے کلچرز کا مقابلہ کر سکیں گے اور چند بنیادی غلط فہمیاں دور کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

نامیاتی طور پر انسان علم الحیات (بائیالوجی) کے حلقۂ اثر میں آتا ہے۔ میں ذیل میں ایک تحریر پیش کرتا ہوں کہ جس سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اس مضمون کا عنوان بائیالوجی ہے۔ کہ جسے ٹی ہکسلے اور پی سی میچل نے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے۔ جو کہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"علم الحیات یعنی بائیالوجی کا اُن امور سے تعلق ہے جو کہ مادہ (زندہ) کی نقل و حرکت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور جیسا کہ ہم عموماً عقلی طور پر اسے مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یعنی اُن نقل و حرکات کو۔ مثلاً وہ حرکات جو کہ انسان سے سوسائٹی میں سرزد ہوتی ہیں۔ اور ہم ان حرکات کو بھی بہت سے عنوانات کے زیرِ اثر لا سکتے ہیں۔ مثلاً سائیکالوجی اور سوشیالوجی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ قدرت نے کوئی ایسی حد مقرر نہیں کی ہے کہ جس کے ذریعہ سے ہم مؤخر الذکر سائنس کو اوّل الذکر سائنس سے الگ قرار دے سکیں۔ سائیکالوجی اور سوشیالوجی کا براہِ راست فزیالوجی سے تعلق ہے۔ اور سوشل زندگی کی وہ تصاویر جو کہ انسانوں کے علاوہ جانوروں سے سرزد ہوتی ہیں۔ جو کہ کبھی کبھی تعجب خیز طور پر انسانی پالیسی کی بھی عکاسی کرتی ہیں بھی بجا طور پر بائیالوجی کے دائرہ عمل میں آتی ہیں۔"

مندرجہ بالا یہ بات صاف طور پر بتاتی ہے کہ انسان کی سوشل زندگی کا بہ نظرِ غور مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق نہ صرف انسانی عقل سے ہے بلکہ انسانی جسم سے بھی ویسا ہی ہے۔ کیونکہ ہم مندرجہ بالا تحریر میں دیکھ چکے ہیں کہ سوشیالوجی اور سائیکالوجی کا براہِ راست فزیالوجی سے تعلق ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ یہ ایک نقصان دہ امر ہوگا اگر کلچر کا تعلق مادی وجود سے تو ہو مگر روحانی طرف کو یہ بالکل فراموش کر دے۔ اور اگر کلچر صرف روحانی حالت ہی کی دیکھ بھال کرے تو یہ بھی نقصان دہ ہوگا۔ کیونکہ جسم رُوح سے الگ نہیں ہے۔ اور رُوح جسم سے الگ نہیں ہے۔ اس لئے ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو کہ انسانی زندگی اور سوسائٹی کا ہر لحاظ سے خیال رکھتا ہے۔

(باقی)

کریم اللہ خان ناصر

رنگ برنگے

۱۔ مذاق ——

حقّے کا کش لیتے ہوئے ایک جٹ آگے بڑھا اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے (Saper Jet F-86) کے متعلق ایک طالب علم سے دریافت کیا —— یہ کیا ہے ——؟

—— "جٹ" —— شرارت کی پڑیا نے جواب دیا۔

۲۔ پاس ——

"تمہارے پاس بس کا پاس ہے ؟"

"جی! میں تو ابھی تک پاس نہیں ہوا —— ویسے مجھے بس کا اور آپ کا بڑا پاس ہے" ——

۳۔ راہِ فرار ——

"کیوں میاں! سگریٹ پینا کب سے چھوڑ دیا ہے ؟" ——

"جب سے آپ نے شروع کر دیا ہے" ——

عبدالسلام اختر ایم۔اے

گھٹیالیاں (ضلع سیالکوٹ) کا ایک منظر

ندیم! دیکھ ایسی رُت میں گھٹیالیاں کے عالم کا یہ نظارا
حیاتِ فانی کی بندشیں ہیں درِ تصور پہ بارا بارا
خموش کھیتوں میں چند خوشے کھڑے کھڑے سرسرا رہے ہیں
ہواؤں کے گرم سرد جھونکے۔ نہ آ رہے ہیں نہ جا رہے ہیں
یہاں کی دُنیائے آب و گِل کی عجیب ہے دولتِ فسانہ
یہاں گذرتا نہیں تغیر۔ یہاں بدلتا نہیں زمانہ
یہاں کے ہر برگ کی کہانی شنیدنی ہے نہ دیدنی ہے
یہاں کے ہر پھول کی زباں پہ بِاَیِّ ذَنبٍ قُتِلتنی ہے
لبِ سڑک ایک چارپائی کے پاس حُقّہ جو نغمہ خواں ہے
تمام افلاک سرنگوں ہیں تمام عالم دُھواں دُھواں ہے
ہیں چند پیر و جواں بڑے طمطراق سے محوِ نغمہ خوانی
وفورِ آہنگ سازِ دوراں۔ سرودِ گُلبانگِ زندگانی
یہ سبز پتے یہ سُرخ کونپل۔ یہ خشک رستے۔ یہ تر گیاہیں
یہاں گذرگاہِ زندگی کی بہت سی ملتی ہیں شاہراہیں
یہ کون سرسوں کے زرد پھولوں میں اوڑھنی سی بچھا رہی ہے
کہ دل تو بیدار ہو رہا ہے۔ خیال کو نیند آ رہی ہے
شعورِ خاموش سے مسلسل خرد کو تلقین ہو رہی ہے
سکوں میں ہیجان آ رہا ہے جنوں کو تسکین ہو رہی ہے
مگر سُن اے ہمنوا! یہ ذرّے زمینِ دل کے گہر بنیں گے
یہ سنگریزے ہی ایک دن بحرِ علم و حکمت کا در بنیں گے

یہی تو ہے سرزمیں کہ جس میں ادب کی لَے شعلہ بار ہوگی
چمن میں گُل لہلہا اُٹھیں گے۔ بنائے دل اُستوار ہوگی

لطف الرحمٰن محمود
(سائنس)

چاند کی سیر

چاند ـــــ جس سے عشق پیشہ شعراء اپنے محبوبوں کے حسین و جمیل چہروں کو تشبیہہ دیتے آئے ہیں ـــــ جس کا نام لے کر مائیں اپنے بلکتے بچوں کو بہلاتی رہی ہیں ـــــ جس کی لطیف چاندنی میں مرد قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں ـــــ اُس چاند پر آج اخباری، سیاسی، طبیعاتی اور کیمیائی دُنیا کی بے تاب اور منتظر نگاہیں مرکوز ہیں، انسان اُسے مسخر کرنے کی خاطر جان پر کھیلنے کو تیار ہے ـــــ اِس عالمگیر دلچسپی کے پیشِ نظر راقم الحروف نے ایک مضمون اِس سلسلہ میں تحریر کرنا شروع کیا۔ خوش قسمتی سے پروفیسر محمد اشرف حسین کی رہنمائی میسّر آگئی۔ آپ کا مقالہ "RAWAL CHRONICLE" میں شائع ہوا جس میں وہ تمام باتیں وضاحت سے آگئیں جنہیں مَیں اختصار سے پیش کر سکتا تھا۔ آپ کے گرانقدر تحقیقی مقالے کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔ ترجمہ سے متعلق راقم الحروف ایک گزارش کرنی چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کئی نئی روشنی کے احباب اندازِ بیان کو "مہذب" بنانے کے لئے اپنی تحریر و تقریر میں جان بُوجھ کر انگریزی الفاظ ٹھونستے ہیں۔ اس ترجمہ میں بعض اصطلاحات اور مقامات کا ترجمہ محض اس لئے نہیں کیا گیا تاکہ دیئے گئے نقشہ[1] سے اصل مقامات اور اصطلاحات کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ ورنہ ایسا کرنے میں کسی قسم کی جدت آمیز بدعت کی تقلید قطعاً پیشِ نظر نہیں ـــــ (محمود)

تصور کیجئے کہ ہم پچیس ہزار میل فی گھنٹہ یعنی سات میل فی سیکنڈ کی رفتار سے جوہری توانائی سے اُڑنے والے برق رفتار راکٹ میں سوار ہو کر چاند کی طرف محوِ پرواز ہیں۔ چاند چونکہ ہم سے ۲۲۸۰۰۰ میل کے فاصلے پر ہے، اس لئے ہمارا یہ دلچسپ سفر ایک قلیل وقت میں ہی اختتام پذیر ہو جائے گا۔ زمین کو چھوڑنے کے بعد جب ہم اس کے حلقے سے باہر نکلیں گے تو اُس وقت سورج کا نظارہ انتہائی حیرت افزا ہوگا۔ ہم دیکھیں گے کہ ایک درخشندہ و تابندہ تھالی ایک تاریک تار آسمان میں چمک رہا ہے۔ آسمان کے تاریک تار نظر آنے کی وجہ یہ ہے کہ اب ہم کُرۂ باد (ATMOSPHERE) سے خلاء (SPACE) میں آگئے ہیں اور جہاں ایسے کوئی ذرات موجود نہیں جو انتشارِ روشنی کا باعث بن سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمین سے آسمان ہمیں ایک ردائے نیلگوں محسوس ہوتا ہے مگر کُرۂ فضاء کے بعد وہی آسمان تاریک و تار نظر آنے لگتا ہے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے توں توں چاند روشن اور واضح ہوتا جائیگا۔ اس کا حجم اور جسامت بڑھتی جائے گی۔ حتّٰی کہ ہم چاند کی سطح پر پھیلے ہوئے مُردہ آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں (CRATERS) سنگلاخ چٹانوں اور دیگر خطوں اور منطقوں مثلاً SEA OF CONFLICTS اور SEA OF RAINS اور SEA OF SERENITY وغیرہ کو ہم بڑی آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ ہم اپنی منزلِ مقصود پر بخیریت پہنچ گئے ہیں لیکن اس سے پیشتر اس کے کہ ہم آگے بڑھیں ہمیں خلائی ملبوسات کو زیبِ تن کرنا پڑے گا۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ہمارے لئے ناممکن ہوگا کہ ہم اپنے نظامِ تنفس کو بحال رکھ سکیں۔ سانس لینا ہمارے لئے دشوار ہو جائے گا۔ کیونکہ چاند میں ہَوا ناپید ہے! ہم یہ تو جانتے ہی ہیں کہ چاند کی سطح پر کششِ ثقل (FORCE OF GRAVITY) کی مقدار زمین پر اس کی مقدار سے چھ گنا کم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس

طبیعاتی صورتِ حال میں ہمارا وزن چھ گنا کم ہو جائے گا اور ہم بہت ہلکے ہو جائیں گے۔ یہاں اگر ہم لطف اندوز ہونے کے لئے ایک چھلانگ لگائیں تو یقین جانیئے ہم ایک بلند عمارت کو پھلانگ جائیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ چاند کی سطح پر کوئی عمارت موجود نہیں!! آخر ہو بھی کیسے سکتی ہے جب کہ چاند پر نہ ہوا ہے اور نہ پانی —— اور یہی وہ لوازمات اور ضروریات ہیں جن سے زندگی عبارت ہے۔ یہ غلط تصور اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے کہ چاند پر پانی اور ہوا بھی موجود ہیں۔ جدید تحقیقات اور تازہ مشاہدات شاہد ہیں کہ چاند کی ساری سطح صرف سنسان اور برہنہ چٹانوں سے بھرپور ہے۔ کسی وقت بحر (SEA) ایک سیال لاوا تھا۔ مگر آج وہ بھی منجمد ہے! اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب ہم چاند کے جس مقام پر کھڑے ہیں وہ تازہ طلوع شدہ آفتاب کی حرارت کی رسائی سے باہر ہے۔ بلکہ (اس وقت بھی) جب وہ پوری تابندگی سے چمکتا ہے اور ایک بادل بھی ایسا نہیں ہوتا جو مزاحم ہو سکے۔ چاند ہوا کے ناپید ہونے کی وجہ سے آفتابی حرارت کو زمین کی طرح جذب نہیں کر سکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہاں شدید سردی ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ سورج آسمان پر ابھرتا اور تیرنے لگتا ہے۔ چاند بھی ہماری زمین کی طرح ایک سیارہ ہے۔ جو ایک مخصوص محور کے گرد بڑی آہستہ خرامی سے گھوم رہا ہے۔ یہ رفتار اتنی سست ہوتی ہے کہ ستائیس دن سات گھنٹے اور چالیس منٹ میں ایک گردش (ROTATION) کی تکمیل ہوتی ہے۔ اگر وہاں ہمیں ایک سائیکل میسر آجائے تو ہم اس کی گردش اور سورج کی رفتار کے ساتھ ہم روش ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہمیں اچھی سڑکوں کی ضرورت ہے جن کا نام و نشان بھی چاند کی سطح پر نہیں۔ دوپہر کے وقت جب کہ سورج آسمان پر چمکتا ہے تو چاند کے استوائی منطقوں (EQUATORIAL REGIONS) میں گرمی ہو جاتی ہے تقریباً اتنی کہ پانی کھول سکتا ہے۔ ایک ایسے مقام پر جو اس وقت آفتاب کے عمود نیچے واقع ہوتا ہے درجہ حرارت ۱۳۰ سنٹی گریڈ

ہو جاتا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم اپنے ہمراہ خلائی ملبوسات لائے ہیں ورنہ اس سخت حرارت اور تیز چمک سے محفوظ رہنا ہمارے بس کا روگ نہ ہوتا۔ اب ہمیں یہاں بہت محتاط رہنا پڑے گا ورنہ ہم ایک مخصوص قسم کے ہیٹ اسٹروک کا شکار ہو جائیں گے۔ اس مہلک ہیٹ اسٹروک کا باعث ULTRAVIOLET RAYS ہیں۔ زمین پر تو ہم اس مخصوص حملے سے اس لئے محفوظ رہتے ہیں کہ ہمارے مہربان خدا نے ہماری زمین کے گرداگرد چالیس میل تک ایک اوزونی کُرّہ (OZONOSPHERE) مہیا کر رکھا ہے۔ OZONE گیس کی یہ موٹی تہ ہمارا دفاع کرتی ہے۔ مگر چاند پر ایسی کوئی دفاعی تہ موجود نہیں ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم زمین سے اپنے ہمراہ ایسے مخصوص دفاعی ملبوسات بھی لائے ہیں جو ہمیں ان جان لیوا مہلک لہروں سے بچاتے ہیں! اِسکے علاوہ شہابِ ثاقب[1] (METEOR) کا شدید خطرہ بھی ہے۔ وہاں چونکہ فضا تو ہے نہیں اس لئے ایسے خطرناک حملوں سے آگاہی نصیب ہونا مشکل ہی ہے۔ پس لازم ہوا کہ ہم ایسے حساس آلات اپنے ساتھ لائیں جو ہمیں ایسے حملوں کی اطلاعات پیش از وقت فراہم کر دیا کریں۔ ورنہ ایک ہی METEOR آئے گا ہمیں اور ہمارے راکٹ دونوں کو تباہ و برباد کر دے گا!

یہ METEORS بہت چھوٹے چھوٹے ستارے ہیں جو سورج کے گرد گھوم رہے ہیں اور اُن کی برق رفتاری کا اندازہ اِس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی رفتار ہماری زمین کی رفتار سے بھی زیادہ ہے۔ (۱۰-۰ ۴ میل فی سیکنڈ)

ہم جس چیز سے سب زیادہ متاثر ہوں گے وہ ہے چاند کی سطح پر مکمل سکوت! کیونکہ چاند کی سطح پر کوئی آواز نہیں سنی جا سکتی۔ آواز تو پیدا ہوتی ہے ہوائی لہروں میں ارتعاش کی وجہ سے —— اور چاند ہوا سے ہی محروم ہے۔ لہذا کسی قسم کے ارتعاش کا

---

[1] "شہابِ ثاقب" صحیح ترجمہ تو نہیں ہے مگر عام فہم ہونے کی وجہ سے کسی حد تک مطلب ادا کر دیتا ہے۔ (مترجم)

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں آواز کا سُنا جانا ناممکن ہے۔ چاند ابدی سکوت کی دُنیا ہے' ایک ایسی دُنیا جہاں بڑی سے بڑی دیو ہیکل توپ سے بھی اگر عظیم دھماکہ پیدا کیا جائے تب بھی خفیف سی آواز بھی قطعاً سُنائی نہ دے گی۔ اگر ہم اُوپر نگاہیں اٹھائیں تو ہمیں سارا آسمان تاریک و تار نظر آئے گا۔ کئی ستارے سورج کی موجودگی میں بھی نظر آئیں گے' خواہ دن ہو یا رات۔ چاند پر ہم ستاروں کا مسلسل نظارہ کر سکتے ہیں۔ مگر وہاں ستارے جگمگاتے نہیں بلکہ ایک لگاتار مسلسل روشنی کے ساتھ چمکتے ہیں۔ کیونکہ ستاروں کے جگمگانے اور ٹمٹمانے کا باعث درجۂ حرارت کے تغیرات ہیں جو کرۂ باد کی مختلف تہوں میں وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور ایسے کرۂ باد سے چاند محروم ہے۔

اگر ہم اُس زمین کی طرف جہاں سے ہم چاند پر آئے ہیں' دیکھیں تو یہ ہمارے سروں پر ایک بڑے چاند کی طرح آسمان میں چمک رہی ہوگی۔ لیکن اس موقع پر ایک ہلال (CRESCENT) کی مانند نظر آئے گی۔ صبح نمودار ہونے کے بعد آہستہ آہستہ گزرتی ہے اور ہماری زمین ہمارے سروں پر وہیں موجود ہوتی ہے۔ البتہ سورج اس کے قریب جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آہستہ سے سورج آگے بڑھتا ہے اور پہلے آدھا غائب ہوتا ہے اور پھر سارے کا سارا ہی غائب ہو جاتا ہے۔ جب سورج مکمل طور پر غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو اس وقت ہم عجیب نظارہ دیکھتے ہیں۔ گو آفتاب مکمل طور پر زمین کے پیچھے غائب ہو جاتا ہے تاہم اس کی تیز سُرخ روشنی اب بھی نظر آئے گی جو ایک تاریک گیند پر محیط ہوگی۔ تاریک گیند ہماری دُنیا ہی ہے ——— ! یہ روشنی اتنی تیز اور شدید ہوتی ہے کہ چاند اس نور کے انعکاس سے خود روشن ہو جاتا ہے۔ اور زمین پر دیکھنے والوں کو چاند گہنایا ہوا نظر آئے گا۔ یہ سُرخ روشنی کرۂ ارضی پر محیط ہو جاتی ہے۔ اور چاند سے اسکے مشاہدے سے ظاہر ہوگا کہ یہ روشنی چاروں طرف سے یکساں نہیں ہے۔ کئی حصوں میں بہت روشن ہوگی اور کئی حصوں میں بہت مدھم۔ وہ حصے جہاں روشنی بہت تیز ہے' ایسے مقامات ہیں جہاں موسم بالکل صاف ہے۔ اور کوئی بادل وغیرہ نہیں۔ اور دوسرے حصے جہاں روشنی مدھم ہے' ایسے مقامات ہیں جہاں طلع ابر آلود ہے۔ اگر مطلع صاف ہو تو سورج کی شعاعیں ہمارے کرۂ باد سے گزر جاتی ہیں اور چاند پر اپنے طویل سفر کے دوران میں اُن کا رنگ اور زیادہ سُرخ ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر بادل چھائے ہوئے ہوں تو ہمیں غروب آفتاب کی سُرخی کی جگہ بھوری سی رنگت نظر آئے گی۔ اور بارش اس صورت حال کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فضا میں متعدد رنگ آمیز شعاعوں کا استخراج ہوتا رہتا ہے۔ یہی منتشر شعاعیں مل کر سفید روشنی کو جنم دیتی ہیں۔ اور سُرخ رنگ کی شعاعوں کو آگے گزرنے کا راستہ مہیا کرتی ہیں۔ ایک اور چیز جو چاند پر بہت زیادہ دلچسپی کا باعث ہوگی وہ ہے گہن کی مدت۔ زمین پر سورج گرہن ایک مختصر سے وقت تک رہتا ہے۔ تقریباً ۷ منٹ بلکہ اس سے بھی کم ——— کیونکہ چاند صرف اتنا ہی نظر آتا ہے کہ بمشکل سورج کو ڈھانپ سکے۔ لیکن چاند پر اس کا مشاہدہ بڑا دلچسپ ہوگا۔ وہاں زمین سورج سے چار گنا بڑی نظر آئے گی اور وہاں سورج گرہن زمین کی نسبت زیادہ لمبا عرصہ رہے گا۔ اس وقت کے دوران میں جب کہ سورج کو زمین ڈھانپ لیتی ہے درجۂ حرارت بہت گر جاتا ہے۔ جب سورج نصف النہار پر آتا ہے تو اُس وقت درجۂ حرارت بہت بڑھ جاتا ہے اور جب سورج زوال پذیر ہونے لگتا ہے تو سردی بھی بڑھنی شروع ہو جاتی ہے۔ اور رات کو یا اُس وقت جب سورج کی روشنی کا راستہ زمین روک لیتی ہے تو وہاں شدید ترین سردی پڑتی ہے۔

ہم چاند کی سطح پر اب جس وقت کھڑے ہیں وہاں سے بلند ترین "کریٹر" زیادہ دُور نہیں ہے۔ آیئے اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ پہلے تو مورچوں کی مانند ٹیلے نظر آئیں گے۔ ہمارے ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ ٹیلے بلند سے بلند تر ہوتے چلے جائیں گے پیشتر اس کے کہ ہم اس کے غیر ہموار کھردرے چبوترے پر پہنچیں بڑے عظیم الشان پہاڑ نظر آئیں گے۔ جو اپنے دامن میں لاتعداد دہشت آفرین خندقیں سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کریٹر کی اصل

"سطح مرتفع آتی ہے۔ ان بلندیوں پر ہم زمین کی نسبت زیادہ تیزی اور آسانی سے چڑھ سکتے ہیں۔ جوں جوں ہم اُوپر چڑھتے جائیں گے توں توں آس پاس کے علاقوں پر نظر پڑتی جائے گی۔ حتیٰ کہ ہم بلند ترین چوٹیوں پر پہنچ جائیں گے۔ یہاں ایک بڑا سا گول گڑھا ہوگا اسے "CRATER OF COPERNICUS" کہتے ہیں۔ اس کریٹر[1] کے کناروں کا نظارہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ دوسرا کنارہ ساٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اندرونی ڈھلوانیں بیرونی ڈھلوانوں کی نسبت زیادہ ناہموار اور غیر یکساں ہیں۔ اس کریٹر کی تہ بیرونی سطح کی نسبت بہت ہی گہری ہے۔ فرش سے لپٹی ہوئی غیر یکساں سائے کی دندانہ دار، غیر ہموار لکیر اُوپر سے دیکھی جا سکتی ہے۔ ہر جگہ حیران کن بربادیوں کا وہی سُنسان ماحول ـــــ وہی تاریک و تار خاموش سائے ـــــ وہی بے گانہ چمکتی ہوئی جگمگاتی روشنی ـــــ وہی ویران سُنسان چٹانیں !! روئیدگی (VEGETATION) کا نام و نشان نہیں ـــــ چرند پرند کا وجود عنقا ہے ـــــ آج تک کسی کیڑے مکوڑے نے وہاں جنم نہیں لیا ـــــ ایک بے جان شوکت و عظمت کے جگر دوز نظاروں کا مسکن ـــــ آتش فشانی ویرانوں کا دیس !!!

"CRATER OF ERATOSTHENES" ـــــ COPERNICUS کے کریٹر سے زیادہ دُور واقع نہیں ہے۔ یہاں کی سطح مرتفع پر گرد آلود بلاسٹر نظر آئے گا۔ بلکہ بعض مقامات پر کریٹر کی دیواریں دھول میں مضمر و مستتر ہونگی۔ یہ گرد آلود پیوند تو زمین سے ہی بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں دھول کی تہ ایک گھٹیا قسم کی روئیدگی سے داغدار ہے۔ مگر یہ "روئیدگی" چاند سے ہی مخصوص ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہاں آفتابی نور اور حرارت سے جو چیز سطح پر اُبھر آتی ہے اُسے "روئیدگی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان گرد آلود پیوندوں کی شکل اور رقبے میں ہر شب کوئی نہ کوئی تغیر اور انقلاب وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث میں کریٹروں کا تذکرہ جا بجا کیا گیا ہے مگر سائنس کے زاویۂ نگاہ سے ان کے وجود پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔ وہ بھی لیجئے۔ ان کے متعلق دو نظریات اب تک پیش کئے گئے ہیں۔

اوّل:- یہ کہ ان کے وجود کا محرک وہ آتش فشانی عمل (VOLCANIC ACTION) ہے ایک مدت گزری کہ وقوع پذیر ہوا۔ اور یہ کہ فی الحقیقت کریٹر ایسے ہی دہشتناک آتش فشاں پہاڑوں کے لرزہ آفرین دہانے ہیں۔

دوم:- دوسرا نظریہ یہ ہے کہ شہاب ثاقب (METEORS) کے چاند کی سطح پر ٹکرانے سے کریٹر نمودار ہوگئے۔ اگر ہم کیچڑ میں روڑے پھینکیں یا کسی روغن میں ہوا کو داخل کریں تو ننھے ننھے کریٹر بن جاتے ہیں۔ اسی طرح بمباری سے زمین کی سطح پر ڈھلوان دار گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق ابھی چاند پر اور نئے کریٹر بننے کا بھی امکان ہے۔

چاند کے متعلق ایک حیرت افزا فیچر یہ ہے کہ TYCHO اور COPERNICUS کے قرب و جوار میں روشن لکیریں اور دھاریاں موجود ہیں۔ زمین سے یہ لکیریں باریک نشانات کی شکل میں نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سفید روغن میں برش ڈبونے کے بعد چاند کی سطح پر ہلکی ہلکی لکیریں کھینچ ڈالی ہیں۔ یہ روشن دھاریاں کہیں بھی پوشیدہ نہیں۔ یہ دھاریاں کوہ و دمن میں یکساں طور پر گزرتی ہیں۔ پورے چاند (بدر) میں ان دھاریوں کا نظارہ اچھی طرح ہوتا ہے۔

جب چاند ہلال کی شکل میں ہوتا ہے اور ارضی چمک (EARTH SHINE) میں خوب تابندگی ہوتی ہے تو ان دھاریوں کی دھندلی سی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دھاریاں ہمیشہ چاند کی سطح پر موجود رہتی ہیں۔ ان کے وجود کی وضاحت کے لئے ایک یہ نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ یہ دھاریاں دراصل وہ بھیانک دراڑیں ہیں جو سفید لاوے سے بھرپور ہیں۔ اور ان دراڑوں کا باعث وہی شہاب ثاقب

---

[1] (CRATER) ان کی وضاحت ایک گزشتہ مقام پر ہو چکی ہے یعنی مُردہ آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ۔ (مترجم)

کی یورش ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ان کا باعث وہ نمکیاتی اور اساسی مرکبات ہیں جو وقتاً فوقتاً چاند کی مٹی سے اُبھرتے رہتے ہیں۔ یہ صورتِ حال پاکستان اور بھارت کے اُن خطوں سے مشابہ ہے جہاں اِس قسم کے مرکبات کی سفید دھاریاں ارضی سطح پر تپیدہ آفتاب کی حرارت اور روشنی کی وجہ سے نظر آنے لگتی ہیں۔

چاند کی سطح پر چند گُنبد نما چیزیں بھی نظر آتی ہیں۔ یہ عمارات یا مقبرے نہیں۔ فی الحقیقت یہ گول گول پہاڑیاں ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایسے آتش فشاں پہاڑ ہیں جو پھٹ نہ سکے۔ ان کے نہ پھٹنے کی وجہ اُن گیسوں (gases) کی بے اثری ہے۔ گیسوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اُن کے دباؤ سے پوست پھٹ جاتا اور لاوا نکل پڑتا۔ پھٹنے کی بجائے پوست سُوج کر آبلوں کی شکل اختیار کر گیا ——— ان گنبدوں میں سے کئی ایسے بھی ہیں جن کے سروں پر شگاف اور دراڑیں بھی موجود ہیں۔

اپنی دُنیا میں واپس جانے سے پیشتر آیئے ذرا چاند کے قطبِ جنوبی (CLAVIUS) کے چند ہولناک خطوں اور اُن لرزہ خیز کناروں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیں۔ مگر یہ سفر بہت ہی مشکل بلکہ بدترین ہوگا۔ کیونکہ ہمیں CLAVIUS تک پہنچنے کے لئے کریٹروں کے ایک وسیع و عریض سلسلہ میں اپنا راستہ متعین کرنا ہوگا۔ ایک کریٹر دوسرے کریٹر کو کاٹ رہا ہے۔ کہیں حیران کُن بلندی ہے تو کہیں وحشت انگیز پستی ہے۔ کہیں انتہائی بلندی پر پہنچیں گے تو کہیں اتھاہ گہرائی اور پستی اچانک آ جائے گی۔ بلندیاں پستیوں میں گھری ہیں اور پستیاں بلندیوں سے بغل گیر ہیں۔ اِن بکھری ہوئی ہولناک بلندیوں اور پستیوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک بھیانک خلیج کے کنارے جا پہنچیں گے۔ یہی CLAVIUS ہے۔ ایک بہت بڑا گڑھا ہے جو بیرونی سطح سے بہت نیچے واقعہ ہے۔ اسکی اندرونی سطح تو بہت گہری ہے۔ اس خلیج کے اندر ایک ڈھلوان ہے جس پر جا بجا ہولناک شکست و ریخت کے گہرے نقوش موجود ہیں۔ یہ ڈھلوان اُلٹی ٹیلی چٹانوں کے انباروں کی امانت دار ہے۔ یہ ڈھلوان تقریباً تین میل تک نیچے چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس خلیج کا فرش آ جاتا ہے!۔ اس فرش پر بہت سے کریٹر موجود ہیں۔ ان کریٹروں میں کئی اتنے بڑے ہیں کہ اُن میں بڑی آسانی سے وینس کو پھینکا جا سکتا ہے۔ چاند کی سطح کے پچک جانے سے یہ کریٹر پیدا ہو گئے ہوں گے۔ یہاں "شہابِ ثاقب" نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ پہاڑوں کی چوٹیاں سدِ راہ بن جاتی ہیں۔!!

اب آفتاب غروب ہونے کے قریب ہے۔ کیونکہ اب نیچے جا رہا ہے۔ شدید سردی کا تیز اثر اب ہمارے خلائی ملبوسات کو بھی چیر کر اندر داخل ہو جائے گا۔ یہ وقت ہے کہ ہم اپنی دُنیا کو واپس بھاگ جائیں۔ اپنی دنیا کو واپس جانے سے پیشتر آیئے ایک دفعہ CLAVIUS پر آخری اُچٹتی سی نظر ڈال لیں۔ جونہی ہم چاند کے قطب پر جاتے ہیں تو دُور اُفق پر عظیم الشان کوہستانی سلسلہ نظر آتا ہے۔ پہلے پہلے تو صرف ان پہاڑوں کی بلند چوٹیاں نظر آتی ہیں مگر جونہی ہم ان کے قریب جاتے ہیں یوں یہ ان پہاڑ بلند سے بلند تر ہو جاتے ہیں ——— مگر دُنیا کے پہاڑوں کی طرح ان کی بلند چوٹیوں پر کوئی برف وغیرہ نہیں۔ حالانکہ یہ پہاڑ اتنے بلند ہیں کہ اُن کی چوٹیاں شبِ تارک کے اندھیروں کے نام سے بھی واقف نہیں۔ کیونکہ سورج ہمیشہ وہاں چمکتا رہتا ہے۔ یہ پہاڑیاں ایک لمحے کے لئے بھی سورج کے نُور سے محروم نہیں رہتیں۔ اِس حقیقت کی وجہ سے اُنہیں "ابدی روشنی کی پہاڑیاں" (MOUNTAINS OF ETERNAL LIGHT) کا نام دیا جاتا ہے۔

رات آ رہی ہے ——— چاند کی رات!۔ اتنی بڑی رات جتنی ہماری دُنیا کی چودہ[14] راتیں! سردی ناقابلِ برداشت

حد تک بڑھ گئی ہے۔ رات کے درمیانی وقت تو درجۂ حرارت منفی ۱۵۰ سنٹی گریڈ تک گر جاتا ہے۔ اگر ہم اپنے خلائی ملبوسات کو برقی قوت سے خواہ کتنا بھی گرم رکھیں، اب ہمارا وہاں رہنا امرِ محال ہے۔ پس ہم دوڑ کر اپنے راکٹ کی طرف آتے ہیں اور دنیا کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔ ہم نے چاند پہ ایک پورا قمری دن (MOON DAY) گزارا جو ہماری دنیا کے چودہ دنوں کے برابر ہے۔ !!!

لاریب چاند ایک کائنات ہے ـــــ مگر عجیب و غریب! بہت ہی انوکھی ـــــ ہماری دنیا سے بہت مختلف۔ برہنہ چٹانیں ہی ہیں ـــــ! سنسان ماحول اور اندھے سکوت میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں !!!! ۔ آہ ہمارا پیارا چاند !!!

۱۔ "قسمت اپنی عنایات دونوں ہاتھوں سے نہیں کرتی ہے۔ وہ غریبوں کو معدہ دیتی ہے لیکن خوراک نہیں دیتی۔ نتیجۃً ان کی صحت کمزور رہتی ہے۔ امیروں کو خوراک دیتی ہے معدہ نہیں دیتی۔ تمام لوازماتِ زندگی کے ہوتے ہوئے وہ ان سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے" ـــــ (شیکسپیئر)

۲۔ "ایک شخص زمین کی طرف دیکھ کر دہریہ ہو جائے تو میں اسے ممکن خیال کروں گا۔ لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی کہ کوئی آسمان کی طرف نظر اٹھائے اور خدا کے وجود سے انکار کر دے۔"

(لنکن)

سمیع اللہ
(ایم۔ اے)

دلِ عجیب شہر ہے خیالوں کا

میری آشفتہ مزاجی کو نہ دینا الزام
عام ہے اب تو ترے حسن میرے پیار کی بات

پھر جنوں ڈھونڈ رہا ہے کسی صحرا میں پناہ
عشق پھر بھول گیا سایۂ دیوار کی بات

کھل اٹھے پھر تری یادوں کے کنول جنگل میں
جب چلی صحنِ چمن میں لبِ رخسار کی بات

کیا میرے شعر بتائیں گے انہیں حالتِ دل
جو نہیں سمجھے میرے دیدۂ خونبار کی بات

پھیل جاتی ہے تیری یاد کی خوشبو ہر سُو
جب بھی سُنتا ہوں کسی سادہ و پُرکار کی بات

اے میرے ہم نفسو فکر کی پرواز کو تم
دیکھنا چاہو ـــ تو سُن لو کسی بیکار کی بات

یحییٰ فضلی

افسانہ

فرار

میں دریا کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں ایک مضبوط چٹان پانی کا رستہ روکے کھڑی ہے۔ پانی اس سے ٹکرا کر واپس مڑتا ہے تو بھنور کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ برسات کے موسم میں تو یہ اتنا خوفناک ہوتا ہے کہ کشتیوں کو بھی نگل لے۔ مگر سردیوں میں اس کا زور گھٹ جاتا ہے۔ خشک پتے اور ٹہنیاں لہروں پر جھولتی ہوئی جب اس تک پہنچتی ہیں تو یکدم بھاگ کر دائرہ کے بیچوں بیچ غوطہ لگا جاتی ہیں۔ میں سوچ رہا تھا۔ اس میں اور غربت کے بھنور میں کتنی مماثلت تو ضرور ہے کہ تنکوں کی طرح غریب بھی بے بس ہوتے ہیں۔ البتہ تنکے ڈوب کر ابھر تو آتے ہیں مگر غریب ایک بار ڈوب کر پھر کبھی نہیں ابھرتا۔

والد صاحب کی زندگی میں تو وہم و گمان میں بھی کبھی نہ آیا تھا کہ ہم پر برے دن بھی آسکتے ہیں۔ ہم امیر تو بے شک کبھی نہ تھے تاہم کچھ ایسے نادار بھی نہ تھے۔ اچانک ایک روز امی کو کمر درد شروع ہوا۔ علاج معالجہ کیا گیا مگر ہر دوا الٹ بیٹھی اور تکلیف بڑھتی گئی۔ علاج سے پہلے صرف کمر میں درد تھا اب سارے پٹھے دھڑکنے لگا۔ اخراجات جب ماہوار بچت سے بڑھنے لگے تو ساری عمر کا پس انداز ہوا روپیہ خرچ ہونے لگا۔ اب صرف درد ہی نہ تھے نچلا دھڑ بے حس ہونا شروع ہوا۔ روپیہ پانی کی طرح بہتا رہا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اندوختہ ختم ہوا اور قرض چڑھنے لگا۔ اور پھر ایک روز ابا جی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ اب گھر بھر کی ذمہ داری مجھ پر آپڑی۔

کالج میں داخل ہوئے ابھی ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ یہ افتاد آپڑی۔ ڈیڑھ دو ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد کچہری میں کلرکی ملی۔

پہلے ہی دن میں پتہ چلا کہ یہاں تو ہر کام رشوت سے چلتا ہے لیکن میں نے سوچا کہ مجھے اس سے کیا سروکار۔ دوسرے لیتے ہیں تو لیتے رہیں۔ ہم نہ لیں گے اور نہ دیں گے مگر یہ پالیسی شاید دفتر والوں کو پسند نہ آئی، ایک روز ایک ساتھی کلرک نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا کہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہ مارو یہاں ملازمت کرنی ہے تو ایسے کام بھی کرنے پڑیں گے ورنہ یاد رکھو یہ لوگ تمہیں برداشت نہیں کریں گے۔ مگر میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ نا صاحب مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ کہنے لگے تو پھر ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے ——— بات آئی گئی ہو گئی۔ میں نے سمجھا کہ جب تک میں کسی جرم کا ارتکاب نہیں کرتا مجھے ملازمت سے کون نکال سکتا ہے۔ مگر بعد کے واقعات نے بتایا کہ میرا یہ خیال درست نہ تھا۔ میرا جرم یہی تو تھا کہ اس جرم میں شرکت کیوں نہ کی۔ اور بھلا وہ یہ بات کیسے برداشت کرتے کہ ایک ایسا شخص اسی دفتر میں رہے جو خود رشوت نہیں لیتا مگر ان کی کرتوتوں سے واقف ہے۔

ایک روز ایک ساتھی کلرک نے میرے گھر آکر پچاس روپے دیئے کہ کل میں دفتر نہیں جا رہا آپ یہ رقم اپنے سیٹ فیلو عارف صاحب کو پہنچا دیں۔ میں نے ان سے قرض لیا تھا اور کل کا وعدہ ہے ——— اگلے روز دفتر گیا تو عارف صاحب

غائب تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی چھٹی پر ہیں۔ گیارہ بجے کے قریب اچانک ایک مجسٹریٹ اور تین سپاہیوں نے آکر مجھے گھیر لیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے حکم دیا کہ کھڑے ہو جاؤ تمہاری تلاشی لی جائیگی۔ مگر میں نے وجہ معلوم کئے بغیر تلاشی دینے سے انکار کیا۔ اس پر غصے سے انہوں نے چیخ کر کہا "ایک تو رشوت لیتے ہو دوسرے اکڑتے ہو، فوراً تلاشی دو۔" دو سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا اور تیسرے نے جیبوں کو دیکھنا شروع کیا۔ جیب سے وہی پانچ نوٹ دس دس روپے کے نکلے۔ مجسٹریٹ صاحب نے غور سے انہیں دیکھا اور کہا ان پر میرے دستخط موجود ہیں۔ یہ تم نے رشوت کے طور پر وصول کئے ہیں۔ میں نے ہزار قسمیں کھائیں کہ صاحب یہ نوٹ فدا نے عارف کو پہنچانے کے لئے دیئے تھے مگر انہوں نے ایک نہ سُنی اور کہا تم یہ دلیل عدالت میں پیش کرنا۔

جب مقدمہ چلا تو فدا صاحب صاف انکار کر گئے کہ یہ نوٹ انہوں نے دیئے تھے۔ اور عارف نے کہا "مجھ سے کبھی فدا نے قرض ہی نہیں لیا۔ اور اگر لیا بھی ہوتا تو ان کے ہاتھ بھجوانے کی کیا ضرورت تھی ہم دونوں ایک ہی محلّہ میں رہتے ہیں ———" اور ایک شخص جسے میں نے پہلی بار اسی عدالت میں دیکھا تھا قسم کھا کر کہنے لگا کہ میں نے یہ نوٹ ان کو رشوت کے طور پر دیئے تھے ——— اب میرے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ رہ گئی تھی۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو پھوٹ بہے۔ میں نے عدالت کو بتایا کہ میرے چھوٹے بھائی بہن اور مفلوج ماں بے سہارا رہ جائیں گے خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔ تو مجسٹریٹ نے کہا تم پر جرم ثابت ہو چکا ہے اس لئے میں سزا دینے پر مجبور ہوں۔ البتہ تمہیں صرف تین ماہ قید کی سزا دی جاتی ہے ——— یہ تھے وہ حالات جن کے تحت میں تین ماہ کے لئے جیل کی چار دیواری میں بند کر دیا گیا۔

مجھے علم نہیں میرے قید ہونے کے بعد اُمّی نے کس طرح گزارہ چلایا۔ جس روز مجھے سزا ہوئی ہمارے گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ امّی چارپائی پر پڑی ہوئی تھیں۔ صرف زبان اور آنکھیں کام کرتی تھیں۔ شوقی اور شاہد معصوم بچے تھے۔ ممّوں کی عمر ہی کوئی آٹھ برس ہوگی ہمارا باقی کنبہ فسادات کی نذر ہو چکا تھا۔ ایسے میں کون مدد کو پہنچتا اور پھر ایک مُجرم کے کنبہ کی مدد کو جو ملک و قوم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔

جُوں تُوں کر کے تین ماہ پُورے کئے مگر جیل سے نکلتے ہی سب سے پہلے جو خبر مجھے پہنچی وہ یہ تھی کہ صرف ایک روز قبل امّی کا انتقال ہو گیا ہے۔ خدا بھلا کرے محلہ والوں کا کہ انہوں نے چندہ کر کے کفن دفن کا انتظام کر دیا۔ گھر پہنچا تو عجیب اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ شوقی اور شاہد روتے روتے سو چکے تھے اور ممّوں رو رو کے بے حال ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ شوقی اور شاہد جاگ اُٹھے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ میرے رونے کا تو وقت نہ تھا۔ انہیں تسلی دی۔ مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ شام کے کھانے کا کیا بندوبست ہو گا۔ کوئی دکاندار قرض دینے کو تیار نہ ہو گا۔ اور کوئی دوست یار ایسا نہیں جو ایسے میں مدد کو پہنچے ——— آخر یہ فیصلہ کیا کہ بازار جا کر مزدوری کروں گا تاکہ کم از کم آٹے کا بندوبست ہو سکے۔

سارے دن میں مجھے صرف چار آنے کا کام ملا۔ شام اسی کا آٹا لے آیا۔ دوسرا، تیسرا اور چوتھا روز بھی یونہی گذرا۔ دفتروں کے چکر کاٹے، لوگوں کی منت سماجت کی مگر رشوت ستانی کا الزام میرے نام کے ساتھ کچھ ایسا چپک کر رہ گیا کہ کوئی بھی مجھ پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھا۔

ایک دن ایسا بھی آیا کہ ایک آنہ کی بھی مزدوری نہ ملی۔ مانگتے شرم آتی تھی۔ نہ جانے کیا خیال آیا کہ چلتا چلتا شہر سے باہر نکل گیا۔ دھیرے دھیرے میں دریا کے کنارے اس چٹان پر کھڑا تھا جس سے ٹکرا کر بپھرا ہوا پانی بھنور کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ——— یکدم خیال آیا کہ کود جاؤ۔ تیرنا تمہیں آتا نہیں یہ بھنور سارے دُکھوں سے نجات دلا دے گا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے شاید میں بزدل ہوں۔ تبھی تو اپنی موت کے خیال سے رونا آرہا تھا ——— ننھے شاہد کا مرجھایا ہوا چہرہ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ شوقی اور ممّوں بھی تصور کے نہاں خانے سے اُبھر رہے تھے۔ تینوں بڑی لجاجت سے کہہ رہے تھے "بھائی جان آپ ایسا خیال دل میں نہ

لائیں۔ آپ کے بعد ہمارا کون ہوگا۔۔۔۔۔" مگر اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ شاہد کا زرد چہرہ، شوقی کی ویران آنکھیں اور ممول کے پریشان بال اب مجھ سے نہیں دیکھے جاتے۔ خدا کی قسم نہیں دیکھے جاتے۔ شاہد مجھے چھوڑ دو۔ شوقی سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ممول مجھے معاف کر دو۔ میں اب زندہ نہیں رہوں گا ——" میرا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ خود بخود میرے قدم آگے بڑھنے لگے۔ اچانک دو مضبوط بازوؤں نے مجھے اپنی جکڑ میں لے لیا۔ اس اچانک حملہ سے میری چیخ نکل گئی۔

"گھبراؤ نہیں میرے بیٹے۔ مجھے علم ہے تم خودکشی کرنا چاہتے ہو۔ مگر دیکھو یہ بزدلی ہے۔ میرے بیٹے تم جوان ہو۔ زندگی کے حقائق سے شکست کھا کر کیوں بھاگتے ہو —— مجھ سے اپنی تکلیف بیان کرو شاید میں تمہارے کام آسکوں۔۔۔۔۔ ڈرو نہیں میرے بیٹے۔۔۔۔ مجھے اپنا ہمدرد سمجھو ——"

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ادھیڑ عمر کا ٹھگنا سا آدمی تھا۔ بھرے ہوئے ہاتھ پاؤں، گنجا سر۔ اس نے نہایت عمدہ لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شفقت اور ہمدردی کی جھلک دیکھ کر بے اختیار میری آنکھوں کے سوتے پھوٹ بہے۔ اور میں نے اپنی سرگزشت کہہ سنائی ——

"بس اتنی سی بات سے تم گھبرا گئے ——" اس نے اس طرح کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو —— "میرے بیٹے مجھ پہ بھی ایسا زمانہ گزر چکا ہے۔ لیکن میں نے کبھی تمہاری طرح ہتھیار نہیں ڈالے۔ خودکشی تو حقائق سے فرار اور شکست کا نام ہے۔ میں نے محنت کی اور آج لاکھوں میں کھیلتا ہوں۔ اتنی دولت ہے کہ سمیٹنی مشکل ہو رہی ہے۔ یہ لو میں تمہیں پچاس ہزار روپے کا چیک دیتا ہوں ——"

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ واقعی جاگتے میں یہ سب کچھ بیت رہا ہے۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا ——

"پچاس ہزار؟"

"ہاں میرے بیٹے پچاس ہزار۔ یہ رقم میرے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے چیک کاٹ دیا۔ کہنے لگے "ابھی جاؤ اور وصول کر کے اپنے نام جمع کرا کے آؤ۔ میں یہاں پر ہی تمہارا انتظار کروں گا۔"

میں بھاگا بھاگا گیا۔ چیک کیش کرانے کے بعد رقم اپنے نام جمع کرائی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر دریا پر پہنچا۔ مگر وہ صاحب وہاں نہ تھے۔ یا خدا کیسا آدمی تھا۔ جس نے بغیر کسی واقفیت اور جان پہچان کے اتنی بڑی رقم مجھے دیدی۔ چیک پر ان کا نام محمد یعقوب مالک یعقوب سنز درج تھا۔ اس سے قبل میں نے کبھی انہیں دیکھا تک نہیں تھا۔

اگلے روز اخبارات میں اس خبر کو پڑھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ شہر کے نامور تاجر سیٹھ محمد یعقوب کل شام دریا میں خودکشی کر گئے۔ انہوں نے ایک تحریر چھوڑی ہے کہ:

"متواتر کئی سال سے میرا ذہن اتنا پریشان ہے کہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے پاس دولت تو ہے لیکن ذہنی سکون نہیں۔ اور یہ سکون مجھے میری دولت نہیں دے سکی۔ اس لئے آج شام ہی دریا میں ڈوب کر ہمیشہ کے لئے ذہنی خلجان سے نجات حاصل کر لوں گا ——"

"زندگی کے سب سے بڑے المیے دو ہیں۔ ایک تو دلی مراد کا نہ پورا ہونا اور دوسرا اس کا پورا ہو جانا۔"

(جارج برنارڈ شا)

"دوستی ایسا پیراہن ہے جس میں وقت اور مقام کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ پیوند لگانا ضروری ہے۔"

(سموئیل جانسن)

یادِ رفتگان

صاحبزادہ معتصم حمایت اللہ خان
(مرحوم)

ایک نام

(پروفیسر صاحب مرحوم نے یہ نظم اپنے شاگردوں کو تعلیم الاسلام کالج میں اپنے آخری ایام میں سُنائی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ نظم سُنانے سے قبل آپ نے سامعین سے تحسین و آفرین کا اظہار نہ کرنے کا وعدہ لیا تھا ـــــ مدیر)

کرن سے دُور
چراغوں کی شاہراہ سے دُور
اُداس ہونٹوں پہ جلتے سلگتے سینے سے
تمہارا نام کبھی اس طرح اُبھرتا ہے
فضائیں جیسے فرشتوں کے نرم پَر کھُل جائیں
دلوں سے جیسے پُرانی کدورتیں دُھل جائیں
تمہارے نام میں صبح کی آہٹوں کا خرام
کسی کنول کو اشارہ۔ کسی کلی کو پیام
تمہارے نام سے یادوں کے کاروانوں میں
چمکتی جاگتی چاندی کی گھنٹیوں کی کھنک
کچھ آنسوؤں کی گھلاوٹ کچھ آرزو کی کسک
یہ بولتی ہوئی شب۔ یہ محیط سناٹا
جیسے تند گناہوں کے سینکڑوں عفریت
بس ایک رات کو دُنیا کے حکمران ہو جائیں
اَجل کے غار سے نکلی ہوئیں گراں روحیں
لہو سے پیاس بُجھا کر کہیں مزاروں سے
نشے کے بوجھ سے بیخیں۔ تو چیختی رہ جائیں

اسی جنوں میں اسی آندھیوں کے میلے میں
تمہارا نام کہیں دُور جگمگاتا ہے
سفید دودھ سے شفاف۔ عکس سے نازک
اُداس رُوح کی لہروں پہ نرم دیپ جلائے
دھوئیں کے گھر میں رہ کے حیات کیا کٹتی ؟
یہ ایک دیپ نہ ہوتا تو راست کیا کٹتی ؟
یہ ایک نام نہ ہوتا تو اس اندھیرے میں
جہاں سحر کا پتہ ہے نہ زندگی کا سُراغ
نہ جانے کتنے عقیدے نہ جانے کتنے خیال
یُونہی پکارتے تھوڑی سی روشنی کے لئے
مَیں سوچتا ہوں کہ تاریکیوں کے طوفاں میں
وہ کتنے لوگ ہیں جن کے نصیب ساحل ہیں
میرے سفر کو چراغوں کے نور کی کیا فکر
میرے سفر کو خود آگاہیاں تو حاصل ہیں
تمہارے نام کی جلتی ہوئی تڑپ نہ سہی
تمہارے نام کی ہمدردیاں تو شامل ہیں۔

محمد الیاس سلیمی
(فنون)

اقبال کا اردو شاعری میں مرتبہ

اردو شاعری میں جس عمارت کی بنیاد حالی نے رکھی اسے اقبال نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ وہ آسمانِ شاعری پر اس درخشندگی کے ساتھ چمکے کہ باقی تمام رنگ ماند پڑ گئے۔ ان کا یہ رنگ دوسرے تمام رنگوں پر چھا گیا۔ دوسرے شاعروں نے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کیا اور ان کی تقلید کو اپنے لئے مایۂ افتخار جانا۔

اقبال کے ابتدائی کلام میں خیالات میں پختگی نہیں، کوئی عمیق فلسفہ نہیں اور نہ ہی کوئی واضح پیغام ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ابتدائے سخن میں ہے اور آہستہ آہستہ ارتقاء کی منازل طے کر رہا ہے۔ فطرت کا دستور یہ ہے کہ جو شاعر ملکوں اور قوموں کو بیدار کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں، وہ زیادہ تر عشقیہ غزلوں کی دلدل میں نہیں رہتے۔ چنانچہ اقبال بھی جلد عشق گوئی کا میدان کو پار کر کے ایک نئے میدان میں آپہنچے۔ جب انہوں نے اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی اور اپنے ماحول کو دیکھا تو محسوس کیا کہ وطن غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، قوم تباہی کے گڑھے میں گرنے والی ہے تو دلگداز نظموں کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کی اور ہندوستانیوں کو آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر دکھائی ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر دیکھ

اور آنے والے مصائب سے آگاہ کیا اور تنبیہہ کی کہ اگر ہندوستانیوں نے اپنے اطوار میں تبدیلی پیدا نہ کی تو وہ صفحۂ ہستی سے بالکل نابود ہو جائیں گے ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

لیکن اقبال کو برادرانِ وطن کی عیاری کا جلد احساس ہو گیا۔ اور اس وقت مسلمان اسلام اور اسلامی ممالک کو خطرہ میں دیکھ کر سہمے ہوئے تھے۔ شاعر چونکہ زیادہ ذکی الحس ہوتا ہے اقبال پر اس مصیبت کا سب سے زیادہ اثر ہوا۔ اب انہوں نے وطن کی فکر کے ساتھ ساتھ عالمِ اسلام کا غم بھی خرید لیا اور رفتہ رفتہ اپنا وطن بھول گیا اور سارا جہان اپنا وطن نظر آنے لگا۔ اب انہوں نے صرف مسلمانوں سے خطاب کرنا شروع کیا۔ اور اس "خاکِ راہ" کو "دارِ الوندی" سکھائے ؎

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میں
کہ خاکِ راہ کو میں نے سکھایا دارِ الوندی

جو فردوس انہوں نے اپنے نغموں سے بسایا ہے، شاید اس کی دلفریبیوں سے انسان متمتع نہ ہو سکتا۔ ایک جنت کو کھو کر انہوں نے اپنے کلام کے اعجاز سے سینکڑوں بہشت اولادِ آدم کے لئے تعمیر کر ڈالے ہیں۔ ان کا کلام صرف واعظانہ نہیں اس میں شعریت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور درد و اثر جو شعر کا لازمی جزو ہے ان کے کلام کا جوہر ہے۔ اس لئے بحیثیت شاعر وہ ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ مولانا حامد حسین قادری فرماتے ہیں کہ اردو شاعری میں میر اور غالب چوٹی کے شاعر ہو گزرے ہیں۔ ان کا کلام بلند پایہ ہے لیکن اقبال میں وہ تمام خوبیاں مجموعی طور پر پائی جاتی ہیں جو میر

اور غالبؔ میں علیحدہ علیحدہ تھیں ۔ فرماتے ہیں :-

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے
جن کی فیضِ طبع نے اُردو کو گنجِ زر دیا
ایک اثر میں بڑھ گیا ایک رفعتِ تخیل میں
تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائناتِ شاعری میں بس یہی دو تو کمال
تیسرے میں اس لئے دونوں کو یکجا کر دیا

اقبالؔ کا گھرانہ تصوف کا پروانہ اور عرفان کا دیوانہ چلا آیا ہے ۔ ایسے ماحول میں عارفانہ آنکھ کا پیدا ہو جانا لازم تھا اس لئے ان کا کلام تصوف اور مذہب میں ڈوبا ہوا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تصوف کے بحرِ بیکراں میں غوطے لگائے ہیں اور بڑے سے بڑے آبدار موتی نکالے ہیں ۔ اور جو خیال انہیں اس آیا ہے وہ ازلی نور کی بدولت سے بقعۂ نور بن گیا ہے ۔ وہ عشق راہیں بسرعت طے کر منبعِ عرفان تک جا پہنچتے ہیں اور واپسی پر مشاہدات کو کچھ اس ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا وجد میں آکر جھومنے لگتا ہے ۔

اقبالؔ نے تمام مشہور اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے ۔ غزل ، رباعی ، قطعہ ، مثنوی ، مسدس سبھی لکھے ہیں ۔ اور ہر ایک صنف میں کامیاب ہوئے ہیں ۔ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں ۔ ان کا کمالِ فن ان ظاہری رسوم و قیود سے بالاتر ہے ۔ ان کے کمال کا انحصار علوِ تخیل پر ہے ، شوخیٔ بیان اور زورِ کلام پر ہے الفاظ و ترکیب کی چستی اور رنگینی پر ہے ۔ اقبالؔ موضوع کا غلام نہیں بلکہ موضوع اس کا غلام ہے ۔ اور کلام میں ہر لفظ اپنی ہستی بجائے خود قائم رکھتا نظر آتا ہے ۔

اقبالؔ کی شاعری فلسفیانہ شاعری ہے ۔ ان کا کلام فلسفیانہ اس رنگ میں ہے کہ وہ ایک کلی تصورِ حیات پیش کرتا ہے ۔ اس کا موضوع فرد اور ملت کی زندگی کا ایک جامع نصب العین ہے جسے ہم فلسفہ تمدن کہہ سکتے ہیں ۔ اقبالؔ صوفیوں کے نظریۂ وحدت الوجود کو نفی خودی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور اُسے اثباتِ خودی سے رد کرنا چاہتے ہیں ۔ گویا اقبالؔ کی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ انفرادی خودی کا قیام ضروری ہے لیکن اگر ملت کا مفاد اس کی قربانی کا تقاضا کرے تو مناسب ہے بےخودی سے سرشار ہو کر خود بلیدان ہو جائے ۔ تاکہ ملت کا بھلا ہو ۔ کیونکہ اجتماعی زندگی صرف انفرادی زندگی کی قربانی سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ جیسے اقبالؔ ایک جگہ فرماتے ہیں :-

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبالؔ کا اشیا یا واقعات کی سطح تک رہنا ناممکن ہے وہ ہر شے کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں ۔ طلوعِ صبح کا منظر ہو یا شفقِ شام کا ، کوہسار کا نظارہ ہو یا سبزہ زار کا ۔ وہ انہیں دیکھتے ہیں اور ان میں یکسر محو ہو کر حقیقت کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ منظر کشی میں زیادہ کوشاں نہیں ہوتے ۔ ان کے فلسفیانہ انداز سے ان کے جوشِ بیان میں فرق نہیں پڑتا بلکہ کلام کی شوکت اور اس کی دلآویزی اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ فلسفہ کا خشک موضوع رنگینی اختیار کر لیتا ہے اور یہی اقبالؔ کا کمالِ فن ہے ۔ الغرض اقبالؔ ایک ایسے شاعر ہیں کہ "بامِ عرش کے طائر" بھی اُن کی ہمزبانی کا شرف حاصل کرنے کے لئے بیقرار ہیں یعنی ؎

اگر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
مَیں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے میرے بحرِ خیالات کا پانی

یہ طائرانہ نگاہ بتلاتی ہے کہ اقبالؔ بیسویں صدی کا وہ زبردست آنسو تھا جو ڈھلکتے ڈھلکتے اس مرحلے پر آکر بہہ گیا اور بنی نوعِ انسان کی کلفتوں کو ہمیشہ کے لئے دھو گیا ۔

ادارہ

گر تُو بُرا نہ مانے!

اُن کو آتا ہے پیار پر غُصّہ
مجھ کو غُصّے پہ پیار آتا ہے

یوں تو ہر کالج میں جہاں صحیح الدماغ طالب علم ہوتے ہیں، وہاں خیر سے چند نقّاد بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس لئے اگر اس کالج میں بھی ایسے نایاب جراثیم آگئے ہیں، تو اسے اللہ کی دین سمجھنا چاہیئے!

ہائے اللہ۔ المنار کی قسمت! ایک انار اور سو بیمار! اس بے چارے پر تو نقّاد اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ گو آج تو یہ حالت ہے کہ نقّادوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ مگر المنار نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب اُن کی تعداد نمک میں آٹا ہو گئی تھی! پہلے پہلے اسے گمنام نقّادوں کی ایک پُوری "رجسٹرڈ" کمپنی سے واسطہ پڑا۔ یہ مرحوم ایک ٹُوٹی پھُوٹی، لُولی، لنگڑی رباعی کے جملہ حقوقِ ملکیت کی واحد اجارہ دار تھی۔ جب کبھی المنار کا شمارہ منصّۂ شہود پر جلوہ افروز ہوتا تو ساتھ ہی معجزانہ طور پر اس رباعی کا بوسیدہ پنجر بھی افادۂ عوام کے لئے نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیا جاتا اور بے چارہ المنار مسلسل دو تین سال تک اس بے نظیر رباعی کو دیکھتا رہا! اب کچھ عرصہ سے باوجود حسرت کے اس رباعی کی زیارت نہیں ہو سکی۔ خدا جانے اسے انڈیا آفس لائبریری والے دُھر لے گئے ہیں یا بابائے اُردو نے ہی ازراہِ اشتیاق منگوالی ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اگر یونیورسٹی کو خبر ہو گئی تو مصنّفینِ رباعی کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے تیار رہنا چاہیئے!

بگوشِ ہوش سنو ہم سنائے دیتے ہیں

خیر یہ تو تعارفی کلمات تھے مطلب یہ ہے کہ المنار کی تاریخ نقّاد حضرات کے احسانات کی رہینِ منّت ہے۔ اس تاریخی رباعی کی گمشدگی کے بعد یہاں نقّادوں کی بڑی قلت ہو گئی تھی۔ گزشتہ تین چار مہینے تو "خشک سالی" میں گزر گئے اور اس جنسِ گراں کا یہ قحط بدستور رہا۔ اور صورتِ حال تشویشناک ہو گئی۔ کیونکہ نقّادوں کی کثرت سے ہی ہماری زندگی عبارت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم مرنے لگے۔ نہ حرکت نہ برکت۔

اِس دفعہ بڑی التجاؤں اور دعاؤں کے بعد ہمیں ایک نقّاد ہاتھ آئے جس سے پُرانی یادوں کے زخم پھر ہرے ہو گئے اب کیا کریں مجبور ہیں ؎

بلائے دوگونہ است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ!

شومئ قسمت! کہ وہ نقّاد صاحب تنقیدی مقالے کا جو اُونٹ اپنے ہمراہ لائے تھے اس کی کوہان ہماری جھونپڑی میں نہیں سما سکی۔ ہم نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر کوئی کل سیدھی

نہ ہو سکی۔ تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ محترم نقاد صاحب ایک معروف ہستی ہیں۔ مگر اُن کے نام سے اُن کی ناقدانہ صفات زیادہ مشہور ہیں۔ خاص کر اُن کی لطافت اور نفاست کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ تنقید کے دلدادہ ہیں، اور ہمیں کسی نے بتایا ہے اپنی ذات پر کسی کی تنقید گوارا نہیں کر سکتے۔ آپ کی تنقید اِس حد تک معقول ہوتی ہے کہ پروفیسر حضرات کو ہاتھ جوڑ کر عرض کرنا پڑتا ہے کہ حضرت معاف فرمائیے تو کرم بالائے کرم ہوگا۔ ایک پروفیسر صاحب نے تو حد ہی کر دی ہے۔ ان کی ہر روز کی "معقول" تنقید سے تنگ آ کر آپ نے ازراہِ قدردانی انہیں SUPER MAN کا خطاب مرحمت فرمایا ہے۔ اور آپ ہیں کہ خطاب کی وصولی کے بعد مصر ہو گئے ہیں۔ اور اِسے پروفیسر صاحب کی شکستِ فاش سے تعبیر کرتے ہیں۔ خیر اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں ع

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اس دفعہ انہیں الٹا ہم پر غصہ آ گیا۔ اور اب ہمیں آپ کے غصے پہ پیار آ گیا ہے! —— انہیں ہماری کس مپرسی پہ بھی ترس آیا تھا۔ یوں سمجھئے کہ ترس کا بحرِ بیکراں متلاطم ہو کر ہماری کس مپرسی کی شکستہ ناؤ کو کنارے لگانے آیا۔ آپ نے ہمیں تنقیدی نگارشات مرحمت فرمائیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ پروفیسر صاحب نے ایسا بلند خطاب دے کے سنگین غلط بخشی کی ہے۔ غلام محمد بخشی نہیں بلکہ غلط بخشی۔ مگر جب ہم نے وہ نگارشات پڑھیں تو استغفار کیا۔ پروفیسر صاحب نے نہایت موزوں آدمی کو خطاب بخشا ہے۔ بارک اللہ!۔

ہم اُن کے اس مقالۂ خصوصی کی ایک آدھ سطر ضرور نقل کرتے مگر قارئین اور خود فاضل مصنف کی حرکتِ قلب بند ہو جانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ ممکن ہے اب وہ خالی الذہن ہوں اور ایسی حالت میں ہی اپنے مقالے پر اُن کی نظر پڑ جائے —— ہم خود بھی شکر کر رہے ہیں کہ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ انہوں نے خصوصی مقالہ ہمیں اس فاتحانہ شان سے عطا فرمایا کہ ہم ماحول سے بالکل بے خبر ہو گئے اور سمجھے کہ جلسہ تقسیم اسناد ہے اور ایک سال بعد ملنے والی بی۔ ایس سی کی سند ابھی عطا ہو رہی ہے —— ہم ضرور پہنچے ع

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

مگر جب پڑھا تو سارا نشہ کافور ہو گیا۔ مرتے مرتے بچے۔ مقالہ دیتے وقت ارشاد ہوا "دیکھیے صاحب۔ اگر ایک لفظ بھی کاٹنا ہو تو مقالہ اشاعت سے پہلے ہی واپس کر دیجئے"۔ ہم ہیں اور عیب بھی مگر ہم دل کے نرم ضرور ہیں۔ وعدہ کر بیٹھے مگر بعد میں یہ سوچ کر چپ ہو لیے کہ ع

وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا

مگر افسوس ہے کہ ہمیں اب ایک تکلیف گوارا کرنی پڑی ہے۔ اُن کے پیہم اصرار نے ہمیں اتنا مجبور کیا ہے کہ ردی کی ٹوکری سے اُن کا مقالۂ خصوصی تلاش کر کے انہیں واپس کرنا پڑا ہے —— ہماری نگاہیں اب منتظر ہیں کہ وہ مقالہ کب قندیل یا ماہِ نو کے صفحات کو چار چاند، آٹھ مریخ اور سولہ عطارد لگاتا ہے!! *

محمد رمضان رسا

غزل

بہکا کے پھیر لائے خیالات راہ سے
کوسوں نکل گئے تھے ہم اپنی نگاہ سے

کیا پوچھتے ہو سوزشِ پنہاں کی انتہا
چاہوں تو شمعِ طور جلا دوں نگاہ سے

مدت میں خالی جام پہ ایسی پڑی نظر
جیسے کسی نے عشق کیا ہو گناہ سے

دامن کے تار رہ گئے مژگاں پہ ٹوٹ کر
کیوں دل میں آپ آئے تھے کانٹوں کی راہ سے

محروم اس طرح ہے اثر سے مری دعا
جیسے کسی نے چھین لی لذت گناہ سے

خوں ہو کے ضبطِ عشق میں ایک ایک آرزو
ٹپکی ہے رفتہ رفتہ ہماری نگاہ سے

مبشر احمد طاہر
(سائنس)

آدمی اور قسمت

دسویں جماعت کے امتحان کے بعد میں سوچا کرتا تھا کہ اگر خدا نے پاس کر دیا تو کالج میں داخل ہو کر ضرور مزید تعلیم حاصل کروں گا۔ اسی دوران اسلامیہ کالج لاہور کے چند طلباء جو میرے واقف کار تھے ملے، میں نے اُن سے پوچھا کہ بھئی! کالج کی پڑھائی کیسے ہوتی ہے ——؟ ایک نے کہا۔ بس گھر سے ایک کاپی لاؤ —— کلاس میں بیٹھو —— لیکچر سنو —— اور گھر چلے جاؤ —— نہ کوئی مارے گا، نہ زیادہ پوچھے گا —— بس استاد جی مزے کرو —— ایک پکنک کے دو آنے فی شرح سے جرمانہ —— بس کچھ نہ پوچھو جناب "پانچوں گھی میں ——"

غرض اُن کی باتوں کا لبِ لباب یہ تھا کہ کالج کی زندگی پھولوں کی سیج ہے —— خدا خدا کر کے ۱۹ اگست ۵۰ء کو ہمارا نتیجہ خوشیوں اور غموں کے جلو میں اخباروں میں نمودار ہوا —— شکر ہے کہ میں پاس ہو گیا اور میری خاندانی کیبنٹ نے کالج میں داخل ہونے کی درخواست منظور کر لی —— کالج میں داخل ہو کر عجیب و غریب رنگ دیکھے اور مجھے ایک پرانا واقعہ یاد آ گیا ——

لاہور میں ایک دن ہم تین لڑکے ایک سائیکل پر جا رہے تھے کہ میری سائیکل کی ٹیوب ایک قیامت خیز دھماکے سے پھٹ گئی۔ ہم اسے اٹھا کر لبِ سڑک سائیکلوں کی ڈسپنسری میں لے گئے —— ایک نوجوان "خوش باش، ہشاش بشاش، اچھے نقش و نگار والا، میلے سے لباس میں ملبوس ٹیوب کی مرمت کرنے لگا —— میں نے اس تندرست نوجوان کو ہر پہلو سے دیکھا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اس سے پوچھا —— "بھئی! تم یہاں کیسے ——؟ کہنے لگا گوجرانوالہ میں آٹھویں میں پڑھتا تھا —— ماسٹر روزانہ مارتا اور گھر شکایتیں لگاتا تھا اسلئے میں بھاگ کر لاہور آ گیا اور اب پان سگریٹ اور روٹی کے پیسے اس طرح پنکچر وغیرہ لگا کر لیتا ہوں —— آگے اس نے ایک عجیب و غریب اور حیران کن بات کہی جس کا میرے مضمون سے خاص تعلق ہے۔ وہ کہنے لگا "میں اسی میں خوش ہوں اور بہت خوش۔ کیونکہ بزرگوں نے کہا کہ جو قسمت میں لکھا ہے وہی ہوتا ہے —— سو مجھے میری قسمت کا لکھا مل رہا ہے" —— مگر نہیں، نہیں!!

یہ لڑکا اور وہ اسلامیہ کالج کے چند طلباء غلط کہتے تھے۔ میں نے کالج میں صرف یہ دیکھا کہ لڑکا اپنی قسمت کا خود معمار ہے —— قسمت بنانے سے بنتی ہے ——

اگر ان کا کہنا سچ ہے تو ہم مریض کو دوا کیوں دیتے ہیں؟ اگر اس کی قسمت میں بچنا ہو گا تو وہ بچ جائے گا —— اگر ہم خود ہی گاڑی کے نیچے آ جائیں تو قسمت بیچاری کیا کرے گی ——! غرض قسمت کا معمار انسان خود ہے ——

میں نے پہلے ذکر کر دیا ہے کہ اسلامیہ کالج کے طلباء نے مجھے کہا تھا کہ کالج میں پانچوں انگلیاں گھی میں ہوتی ہیں —— چنانچہ میں اپنے مشاہدہ کی بناء پر کالج کی زندگی کو تین قسم کے گھی میں تقسیم کرتا ہوں۔

۱۔ خالص ترین دیسی گھی والا ماحول ——

۲۔ ناخالص گھی (جس میں بنولے اور چربی شامل ہے) والا ماحول ——

۳۔ ڈالڈا (گھی کی ایک ادنیٰ قسم) نما ماحول ——

سب سے پہلے خالص ترین دیسی گھی آتا ہے —— اس کے

بارے میں مجھے وضاحت کی ضرورت نہیں ـــــ یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ خالص گھی سے انسان صحت مند رہتا ہے اور طاقت حاصل کرتا ہے اور پھر تمام عمر اس کا مزہ اُٹھاتا ہے۔ علامہ ڈاکٹر اقبال، قائدِ اعظم، ابراہام لنکن اور آئزن ہاور اس کی مثالیں ہیں ـــــ

اس ماحول میں وہ لڑکے رہتے ہیں جن کو پڑھائی کا شوق ہے، جنہیں اپنے مستقبل کا احساس ہے، جو بُری سوسائٹی سے بچ کر محنت کرکے دیسی گھی کی چُوریاں کھاتے ہیں ـــــ

دوسرے نمبر پہ ناخالص گھی والا ماحول آتا ہے ـــــ اسکو کھا کر انسان اتنا تندرست و توانا نہیں رہتا جتنا کہ خالص سے۔ بہرحال اس میں طاقت ضرور ہوتی ہے ـــــ اس میں وہ لڑکے شمار ہوتے ہیں جو محنتی تو ہیں مگر بُری صحبت میں بیٹھ کر اپنے وقت کو ضائع کرکے، اپنی ذہنی صلاحیتوں سے فائدہ نہ اُٹھا کر اور اپنے مستقبل سے بے بہرہ رہ کر خراب ہو رہے ہیں۔

یہ ماحول اگر ذرا سمجھ سے کام لے تو اس پر خالص دیسی گھی کا لیبل چپک سکتا ہے ـــــ

آخری اور تیسرے نمبر پہ ڈالڈا آتا ہے ـــــ بعض لوگ غلطی سے اس کو گھی کا نام دیتے ہیں ـــــ اس کو کھا کر کھانسی، سل دق، زکام، گلے اور دیگر اسی قسم کی بیماریاں آ ڈیرے ڈالتی ہیں۔ کالج کے ماحول کا یہ خطرناک ماحول ہے ـــــ اس میں وہ لڑکے آتے ہیں جو اپنے مستقبل کو نہیں سمجھتے۔ عیش کرتے ہیں۔ ان کو ہر وقت پڑھائی سے بغاوت سُوجھتی ہے۔ پکنک ان کی خوراک ہے، سیر و تفریح ان کا من بھاتا کھاجا ہے ـــــ جرائم، غیر حاضریوں اور شرارتوں میں ان کا ریکارڈ ہوتا ہے ـــــ یہ ڈالڈا نما ماحول ہر ایک کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے ـــــ مگر سمجھدار اور باہوش طلباء ان سے دُور رہتے ہیں ـــــ

میں دیکھتا ہوں کہ ڈالڈا کمپنی ہر وقت اپنا قیمتی وقت ضائع کرتی ہے ـــــ پڑھائی کے وقت یہ ایک ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے بیٹھی رہتی ہے ـــــ ایک دن ایک ڈالڈا نما لڑکا مجھے کہنے لگا "آؤ یار مبشر! دُھوپ میں بیٹھیں ـــــ" میں نے کہا کہ فزکس کا پیریڈ ہے ـــــ کہنے لگا ـــــ "بس یار دو آنے سے ڈر گئے" ـــــ دوسرا جیب سے دونی نکال کر کہنے لگا۔ "یہ لو دونی اور اب تو آجاؤ ـــــ"

ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ ڈالڈا زیادہ سے زیادہ بکے ـــــ دوسرے ہی دن ہمارا پریکٹیکل تھا ـــــ مگر شاید رشید صاحب کا کوئی شادی بیاہ کا سلسلہ تھا اسلئے ہمیں چھٹی ہوگئی۔ آگے میں نے جو دیکھا تو ڈالڈا فیکٹری کی کونسل لگی ہوئی تھی ـــــ میں نے ان کو کہا کہ چھٹی ہوگئی ہے ـــــ میرا یہ کہنا تھا کہ سب کی خوشی سے باچھیں کھل کر کانوں کو جا لگیں ـــــ

ایک نے سگریٹ کا ٹوٹا سلگاتے ہوئے کہا ـــــ "مبشر! آج تُو نے کام کیا ہے سولہ آنے کا" ـــــ

یہی ہیں وہ لڑکے جو بعد میں کہتے ہیں "جو قسمت میں لکھا ہے وہ مل جائے گا" ـــــ قصور اپنا اور الزام بیچاری قسمت پر ـــــ

مندرجہ بالا مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ اگر "ڈالڈا" کوشش کرے تو وہ ناخالص گھی، اور پھر ناخالص خالص گھی میں تبدیل ہو سکتا ہے ـــــ

سو اگر آپ نے دُنیا میں کچھ نام پیدا کرنا ہے تو کالج کی زندگی کے خالص گھی والے ماحول میں شامل ہو جائیں ـــــ محنت کریں ـــــ شوق سے پڑھیں ـــــ ڈالڈا اور دوسری بُری سوسائٹیوں سے بچیں ـــــ مستقبل کی فکر کریں ـــــ پھر اللہ تعالےٰ ضرور مدد کرے گا ـــــ

ہم سب کو چاہیے کہ جو چار یا پانچ سیر ڈالڈا ہمارے کالج میں ہے اس کو بھی خالص دیسی گھی کے کنستر میں انڈیل دیں ـــــ

"صرف تعلیم سے شرافت کا حصول ایسا ہی مہمل خیال ہے جیسا کہ علم کیمیا کے ذریعے سونا کا بنانا۔"
(ارسطاطالیس)

خلیل الرحمٰن خان خلیل
(فنون)

غزل

جب تری یاد کوئی واقعہ دُہراتی ہے
چاندنی ۔ چڑھتی ہوئی دُھوپ نظر آتی ہے

کیا ہوا ۔ ہنس لئے دنیا کے دکھانے کو کبھی
یوں تو اِک سُوکھی ہوئی شاخ بھی لہراتی ہے

ہر حسیں چیز کے اِس درجہ فدائی نہ ہو
دوستو ۔ دل کی لگی دار پہ لے آتی ہے

کون چاہے گا کہ ہر روز نیا دُکھ جھیلے
یہ تو اِک تیری تمنّا ہے کہ اُکساتی ہے

یوں بھی اکثر تیری قربت میں ہوا محسوس
کوئی شے دُکھتے ہوئے زخم کو سہلاتی ہے

کوئی راتوں کے تڑپنے کا سبب ہو تو بتاؤں
نیند آتی ہو تو کانٹوں پہ بھی آجاتی ہے

کوئی آواز کوئی گونج کوئی نغمہ ہو
تیری تصویر نگاہوں میں اُتر آتی ہے

ذرۂ خاک میں وہ شعلہ نہاں ہے یارو
جس کی گرمی سے ہر اِک چیز جلا پاتی ہے

اپنی قسمت میں وہی بے سرو سامانی ہے
گردِ ملکوں پہ بدستور جمے جاتی ہے

محمد ہادی مونس
(فنون)

غزل

مَیں دل لُٹا کے اتنا پشیماں نہ تھا کبھی
یعنی کہ حال اتنا پریشاں نہ تھا کبھی

فکرِ حیات اور غمِ عشق ساتھ ساتھ
اُلفت نہ تھی تو گھر مرا ویراں نہ تھا کبھی

گلشن میں سربلند تھا ہر ایک خار کا
عہدِ بہار قابلِ درماں نہ تھا کبھی

دل پاش پاش گیسوئے پیچاں ہے تار تار
یہ سلسلہ تو اتنا پریشاں نہ تھا کبھی

کیا پوچھتے ہو کیفیت اِس چشمِ مست کی
طوفانِ دل کا آج تک اِمکاں نہ تھا کبھی

ہر سمت عکسِ جلوۂ حُسنِ خیال ہے
مَیں زندگی میں صاحبِ دیواں نہ تھا کبھی

دل پہلے چاک چاک تھا اب داغ داغ ہے
یہ کفر تیرے عشق میں ایماں نہ تھا کبھی

فکرِ معاش ہجرِ صنم یادِ رفتگاں
پہلے تو میرے پاس یہ ساماں نہ تھا کبھی

گذری گراں ہے موجِ نفسِ دل بار بار
اتنا بھی دل کا آئینہ حیراں نہ تھا کبھی

گو آشنائے گنبدِ گردوں تھی ہر صدا
مُونس کا گھر فضائے بیاباں نہ تھا کبھی

کلیم اللہ خان
(سائنس)

افسانہ

انجام

سرما کی ایک سخت سرد شام تھی ـــــ دُور ـــــ بہت دُور ـــــ آفتاب عالمتاب کی آخری کرنیں کالے کالے پہاڑوں کی اوٹ میں پوشیدہ ہوگئی تھیں ـــــ اور سورج مغربی اُفق کے پار اُتر چکا تھا ـــــ اور اُفق کے کنارے کنارے گاڑھے سُرخ رنگ کے ساتھ پیلے پیلے اور سپید رنگوں کے امتزاج نے نیلے نیلگیں بادل، آسمان کی خوبصورتی کو اور بڑھا دیا تھا ـــــ

بادلوں کے چھوٹے چھوٹے سیاہ ٹکڑے وسیع و عریض آسمان پر اِدھر اُدھر ہوا کے جھونکوں سے تیرتے پھر رہے تھے ـــــ سائے دھندلے ہو چلے تھے۔ لانبے لانبے درخت اور ہرے ہرے کھیت شبنمی اوس و دُھند سے تر ـــــ سربسجود دکھائی پڑتے تھے ـــــ

پرندوں کے غول کے غول شور مچاتے ہوئے اپنے بسیروں کی جانب محوِ پرواز تھے ـــــ تھکن سے سُکڑے ہوئے ـــــ تھکے تھکے سے مضمحل کسان اور مزدور، کدال اور ٹوکریاں کاندھوں پر رکھے ـــــ ہلوں کو گھسیٹتے ـــــ بیلوں کو ہنکاتے ـــــ دن بھر کی محنتِ شاقہ کے بعد سُست رفتاری کے ساتھ، بھاری بھاری قدموں ـــــ حُقّے کے کش لگاتے ہوئے ـــــ فصلوں کے متعلق گفت و شنید کرتے ہوئے ـــــ گاؤں میں داخل ہو رہے تھے ـــــ

گاؤں کے اطراف ـــــ فاصلے پر تھوڑی تھوڑی گرد و غبار نظر آ رہی تھی ـــــ اس گرد و غبار کے بادل ـــــ اور دھندلکوں کے پردے میں سے چند مدھم مدھم صورتیں دکھائی پڑتی تھیں ـــــ

اچانک تیزی سے سید الطاف اور اس کے چند ساتھی ـــــ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ـــــ گرد و غبار اور دھندلکوں میں اضافہ کرتے ـــــ اپنے سُرخ اُونی شالوں کو لہراتے ہوئے گاؤں میں آ دھمکے ـــــ

بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں، اور گھوڑوں کی ٹاپ ـــــ اس دھندلکے اور خنکی میں ایک مؤثر سا نغمہ فضا میں بکھیر رہی تھیں ـــــ دیہاتی عورتیں پنگھٹ سے پانی کے گھڑے لاتی دکھائی پڑتی تھیں ـــــ اور دیہات کی روشنیاں ٹمٹماتی نظر آتی تھیں ـــــ

اب مدھم مدھم روشنی شام کے گہرے دھندلکوں سے گلے مل کر ان میں جذب ہو چکی تھی ـــــ لیلائے شب نے اپنے سر سے لبادہ کو پھیلائے ایک طویل انگڑائی لی اور وہ آناً فاناً سیاہ ہو گیا ـــــ زمین و آسمان کی فضائے محیط و بسیط پر ظلمت و تاریکی نے تسلط لیا ـــــ

چند ہی لمحوں بعد ڈھلکوں کی آواز نے میلوں میل تک اپنے جال بُن دیئے ـــــ آج سید الطاف بہت خوش تھا ـــــ بہت خوش ـــــ وہ مقدمہ جیت گیا تھا ـــــ اب وہ مرحوم باپ کی ساری جائیداد کا مالک تھا ـــــ ساری جائیداد ـــــ اب وہ دولت میں کھیلنے لگا ـــــ اور دولت کے جھوٹے نشے میں چُور رہا ـــــ اس کے پاس دوستوں اور خوشامدیوں کا ہجوم رہنے لگا ـــــ وہ روزانہ اس کے پاس آتے اور گلچھرے اُڑاتے ـــــ

اس کی ناتجربہ کاری اور عیش و طرب کی محفلیں ـــــ اس کی جائیداد کو چاٹ گئیں ـــــ وہ آمدنی جو سونے میں تُلتی تھی اور وہ زمین جو سونا اُگلتی تھی ـــــ بڑے بڑے گاؤں ـــــ بڑی بڑی حویلیاں ـــــ وسیع و عریض چراگاہیں ـــــ ایک ایک کر کے اس نے کوڑیوں کے بھاؤ بیچ ڈالے ـــــ دولت پھلجھڑی کی طرح ختم ہونے لگی ـــــ اب وہی دوست اُس سے دُور رہنے لگے ـــــ اب وہ غریب ہو چکا

تھا ـــ بے زر ـــ

دُنیا میں غریب کا کوئی سہارا نہیں ـــ یہاں تو لفظی ہمدردی کی بھی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ـــ کشش تو صرف دولت میں ہے ـــ عزت تو صرف امیروں کے لئے مخصوص ہے ـــ غریب تو غریب ہی ہوتا ہے ـــ امیر غریب کو دباتا ہے ـــ غریب دبتا ہی جاتا ہے ـــ حتیٰ کہ اُٹھ بھی نہیں سکتا ـــ امیر غریب کا خون چُوستا ہے ـــ لیکن ـــ دونوں کے ساتھ ساتھ ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو امیر کا خون چُوستا ہے ـــ اور اُن کی دولت کو اس طرح مٹی بناتا ہے جس طرح دیمک لکڑی کو چاٹ کر مٹی میں تبدیل کر دیتی ہے ـــ ایسے لوگ ہر امیر کے ہاں ہوتے ہیں اور ہمیشہ اپنے نفع کی سوچتے ہیں ـــ

دولت کی فراوانی اور دوستوں کی بے جا تعریف نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی ـــ اور وہ دونوں ہاتھوں دولت لٹانے لگا ـــ وہ بہت مغرور تھا ـــ بہت مغرور ـــ وہ دُنیا کو جنت اور ان جھوٹے دوستوں کو سچے دوست سمجھ بیٹھا ـــ

دولت خاں الطاف کو سمجھاتا اور ایسے دوستوں سے دُور رکھنے کی کوشش کرتا ـــ وہ اکثر کہتا تھا ـــ "یہ سب جراثیم ہیں جو سکوں کی جھنکار کے ساتھ یہاں اکٹھے ہوئے ہیں ـــ وہ سکوں کی کھنک کے خاتمے کے ساتھ ہی ہوا میں منتشر ہو جائینگے۔ ـــ یہ مُنہ بولے دوست، وقتی دوست ہیں ـــ یہ اصل میں آگ کے دہکتے ہوئے انگارے ہیں جنہیں تم پھول سمجھ کر کھیل رہے ہو ـــ یہ تمہیں کسی وقت بھی جلا کر خاکستر کر سکتے ہیں ـــ کاش! کوئی ایسا وقت آئے جب جھوٹے اور سچے میں تمیز ہو سکے ـــ"

لیکن الطاف اس کی باتوں پر دھیان نہ دیتا ـــ آخر وہی ہوا جو سامنے نظر آ رہا تھا ـــ دوستی سب ختم ہوئی اور نام نہاد دوست ایک ایک کر کے جُدا ہونے لگے اور اگر کہیں راستے میں مل بھی جاتے تو کترا کر نکل جاتے ـــ الطاف کی دُنیا اندھیر ہو گئی ـــ اب اس کا کوئی ہمدرد و مددگار نہ تھا ـــ

"تم یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتے ـــ جتنے خرچ کی ضرورت ہو وہ مجھ سے لے لو اور کہیں اور جا کر نوکری تلاش کر لو ـــ" دولت خاں نے کہا۔

.. ..

مگر اب الطاف ایک چور تھا ـــ چور ـــ چور انہیں لوگوں کو بننا پڑتا ہے جن کے پیٹ میں روٹی نہ ہو ـــ اور ہاتھ میں ہُنر نہ ہو ـــ پہلے پہل وہ چھوٹی چھوٹی چوریاں کرنے لگا ـــ اور وقت اپنی برق رفتاری سے گزرتا گیا ـــ لیکن سید الطاف اس زندگی سے تنگ آ چکا تھا ـــ اور اس نے ایک بڑی چوری کر کے زندگی بنانے کی ٹھان لی ـــ

ایک رات جب وہ ایک امیر کے مکان میں چوری کر کے دیوار پھاند رہا تھا ـــ تو روشنی کا ایک دائرہ اس کے قریب ناچنے لگا ـــ اس نے جلدی سے چھلانگ لگائی اور بھاگنے لگا ـــ لیکن تعاقب کی آواز اس کے کانوں کے پردوں پر برابر ہتھوڑے مار رہی تھی ـــ وہ اندھیری گلیوں ـــ اور سنسان بازاروں میں سے ہوتا ہوا دولت خاں کے مکان پر جا پہنچا ـــ اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا ـــ دولت خاں نے دروازہ کھولا ـــ اور خوش آمدید کہا ـــ اُسے لا کر بٹھایا۔ ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ دروازہ کھُلا ـــ سپاہی نے داخل ہوتے ہوئے کہا ـــ

"اگر بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دی جائے گی"۔

دولت خاں نے اتنے میں سب کچھ سوچ لیا ـــ الطاف نے بھاگنے کی کوشش کی ـــ سپاہی نے بندوق چلائی ـــ لیکن دولت خاں سامنے آ گیا ـــ گولی اس کے سینے میں لگی اور پار ہو گئی ـــ سپاہی اُسے سنبھالنے کے لئے آگے بڑھے ـــ اور الطاف اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھاگ نکلا ـــ مگر بہت دُور جا کر اگلے روز پکڑا گیا۔

اور اُسی شام سورج غروب ہو رہا تھا اور دن کی روشنی شام کے دھندلکوں سے گلے مل رہی تھی ـــ فضا میں خنکی بڑھ رہی تھی ـــ پرندے آشیانوں کی جانب محوِ پرواز

تھے —— اور تمام فضا منجمد منجمد سی تھی اور خاموشی اور اداسی نے ڈیرے ڈال دیئے تھے —— گاؤں کو آنے والی سڑک پر رہٹ کی جانب گرد و غبار کے بادل —— اور —— دھند و دھوئیں کے پردوں کے اُس طرف —— مغرب سے مشرق کی طرف —— چند سپاہی سید الطاف کو پکڑے چلے آ رہے تھے —— اِدھر زنجیروں کی جھنجھناہٹ —— دوسری طرف —— ذرا پرے، بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی کھنک سے کہیں زیادہ شور بپا کر رہی تھیں —— اور فضا میں اداس —— اُداس سا نغمہ بکھیر رہی تھیں ——

الطاف اب کچھ نہ سُن سکتا تھا —— اس کے کانوں میں دولت خاں کے وہ الفاظ گونج رہے تھے۔

—— "یہ دوست نہیں ! مجرم ہیں ..... یہ سب ہوا میں منتشر ہو ...... یہ آگ کے دہکتے ہوئے ...... جو کبھی بھی تمہارا دامن جلا ..... کاش ! کوئی ایسا وقت آئے ..... جھوٹ اور سچ کی تمیز ہو سکے" ——

نقد و نظر —— (بقیہ ص ۳۴)

کی قندیل فروزاں کر کے محبتِ وطن اور قابل طالب علموں کو جنم دیکر وطنِ عزیز کو اچھے شہری بہم پہنچا رہا ہے وہاں مردانہ فنون کے احیاء، ارتقاء اور بقاء کا سامان بھی مہیا کر رہا ہے —— ابھی تو ابتدا ہے - یہ ہلال بدر بن کر رہے گا —— سیلانی کی یہی دُعا ہے ؎

تری اُٹھان ترقی کرے قیامت کی
ترا شباب بڑھے عمرِ جاوداں کی طرح

"صرف نیک ہی نہ بنئے کسی کے ساتھ
نیکی کیجئے"

(بھوریو)

لطف الرحمٰن محمود
(سائنس)

غزل

○

دامِ شفق ہے چاک گریباں تو دیکھئے
لایا ہے رنگ خونِ شہیداں تو دیکھئے

تعبیر جس کی زلفِ گرہ گیر بھی نہ تھی
دیکھا وہ ہم نے خوابِ پریشاں تو دیکھئے

ساحل کا کیا ہے یہ گیا گر موجِ بحر میں
ناؤ سے کھیلتا ہوا طوفاں تو دیکھئے

میرے اُداس شام و سحر پہ نہ جائیے
عارض پہ اپنے زلفِ پریشاں تو دیکھئے

اِس دَور میں بھی لب پہ وفا ہی کا نام ہے
خود کر رہا ہوں موت کا ساماں تو دیکھئے

تارے بڑے ہوئے ہیں ہر اک نوکِ خار پر
محمود آج حسنِ بیاباں تو دیکھئے

حمید احمد
(فنون)

دُنیا کا سب سے پہلا کُتب خانہ

طوفانِ نوح کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد دریائے دجلہ و فرات کے کنارے کنارے پھیلنی شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ انہوں نے اس علاقہ میں اپنی آبادیاں قائم کر لیں۔

یہ لوگ دریائے دجلہ و فرات کے درمیانی علاقے میں بستے تھے۔ دجلہ اور فرات آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ ابتداء میں ان دونوں کی گذرگاہیں الگ الگ تھیں مگر مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ دونوں ایک دوسرے سے مل گئے۔ یہ دونوں خلیج فارس میں جا گرتے ہیں۔ وہ علاقہ جہاں یہ ایک دوسرے سے مل کر بہتے ہیں "شط العرب" کے نام سے مشہور ہے۔ بصرہ کا مشہور شہر اسی دریا کے کنارے واقع ہے۔

شط العرب کا درمیانی علاقہ زرخیز میدانی علاقہ تھا ابتدا میں اس علاقہ کا نام میدان "شنعار" تھا جس کے معنی ہیں بہت پانی والی وسیع جگہ۔

اسی جگہ سرکش و خدا فراموش بنی آدم نے بابل کا مشہور مینار تعمیر کیا تھا تاکہ اس کے ذریعے سماوی اسرار دریافت کئے جائیں اور اسی مقام پر حام بن نوح کے پوتے کوش اور کوش کے بیٹے نمرود نے اپنی سلطنت قائم کی جس کا پایۂ تخت بابل تھا۔ نمرود کے سردار "آشور بانی پال" نے دریائے دجلہ کے کنارے نینوا کا تاریخی شہر آباد کیا۔ آشور بانی پال کے نام کی مناسبت سے یہ علاقہ آشوریہ کے نام سے مشہور ہو گیا اور مغرب والوں نے آشوریہ کو بدل کر آسیریا کر دیا (ملاحظہ ہو عصر قدیم از عبدالحلیم شرر)

نینوا بہت عظیم الشان شہر تھا۔ اس کے گرداگرد نہایت مضبوط شہر پناہ تھی۔ شہر میں بڑے بڑے قصر اور ایوان تعمیر کئے گئے تھے۔ ان کی دیواروں پر نقش و نگار کندہ تھے۔ ان میں بڑے بڑے دیو ہیکل بت بھی تھے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ بت پرست تھے۔

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ نینوا میں خدا تعالیٰ کے انبیاء بھی مبعوث ہوئے اور ان کی عزت و تکریم کی گئی اور حضرت یونس کے وقت خدا تعالیٰ کی توحید کامل طور پر ظاہر ہوئی۔

آشور بانی پال جو نینوا، بابل اور میڈیا کا حکمران تھا بہت عالم اور علم دوست شخص تھا۔ اس کے زمانے میں فن کتابت بہت ترقی کر گیا تھا۔ یہ خود بھی اس فن کا ماہر تھا اور اس میں بحاسے روزگار تھا۔

اس نے مختلف قسم کی تحریریں گیلی مٹی کے چوکور کتبوں پر تحریر کروا کے انہیں آگ میں پختہ کر کے محفوظ کر لیا۔ یہ تحریریں اس زمانہ کے مذہب اور تمدن پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ تحریری کتبے اس زمانہ کی کتابیں ہیں۔ اس زمانہ میں کاغذ کی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی چھاپے خانے تھے۔ کاغذ کی ایجاد چین میں ہوئی۔ اہلِ چین دوسری صدی قبل مسیح کاغذ بنانے لگے تھے۔ اس سے قبل کتابیں مٹی اور پتھر کی سلوں پر لکھی جاتی تھیں اور بعض علاقوں میں تحریر لکھتے بھی اسی غرض کے لئے استعمال کئے جاتے تھے ـــــ لفظ کاغذ خود چینی زبان کا لفظ ہے جو فارسی سے عربی میں آیا ہے۔ اسی طرح عربی لفظ قرطاس (کاغذ) یونانی لفظ (Cartus) سے نکلا ہے۔

چھاپہ خانہ بھی سب سے پہلے چین ہی میں ایجاد ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلی کتاب چین میں ٨٦٨ عیسوی میں چھپی۔ اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں کتب کی تصنیف کے لئے پتھروں کی سلیں اور مٹی کی

تختیاں ہی استعمال کی جاتی تھیں۔ مصر میں پتھر کی سلوں پر الفاظ کھودے کھودے جاتے تھے۔ اس کے برعکس آشور بانی پال نے گیلی مٹی کی تختیوں پر کسی نوکدار چیز سے حروف کندہ کرائے اور پھر ان تختیوں کو آگ میں ڈال کر پختہ کر کے محفوظ کر لیا۔ یہ تختیاں بہت بڑی تعداد میں تھیں۔ ان کی تعداد بائیس ہزار سے زائد بتائی جاتی ہے۔ بہر حال یہ تختیاں اس زمانہ کی کتابیں تھیں اور ان میں ہر علم کے متعلق مواد تھا۔

آشور بانی پال نے اپنے اس کتب خانہ کو بڑی محنت سے ترتیب دیا تھا۔ چنانچہ کتب خانہ کے دو حصے تھے۔ ایک حصے میں علوم سفلی کی کتب ترتیب دی گئی تھیں اور دوسرے حصے میں علوم سماوی سے متعلق کتب مرتب کی گئی تھیں۔

علوم سفلی کی کتب حسب ذیل موضوعات پر مشتمل تھیں[۱] :-

۱۔ علم لغت۔

۲۔ تاریخی حکایات اور رزمیہ نظمیں۔

۳۔ مجموعہ قوانین۔

۴۔ سائنس۔

۵۔ فلسفہ و اصولیات۔

علوم سماوی میں زیادہ تر مذہبی کتب اور الٰہیات سے متعلق کتب تھیں۔ اس کتب خانہ میں اجتماع خصوصی (SPECIAL COLLECTION) کا بھی دستور تھا۔ چنانچہ فوجی ضابطوں اور کاہنی پیشگوئیوں کے مجموعے الگ تھے اور اس کے ساتھ ہی علیحدہ طور پر غیر ملکی تصانیف کا ذخیرہ بھی رکھا ہوا تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ کی محنت اور جد و جہد سے یہ نادر کتبے (کتابیں) برآمد ہوئے اور آجکل یورپ اور امریکہ کے عجائب خانوں کی زینت ہیں۔ ان میں بعض ایسے کتبے بھی ہیں جن میں طوفانِ نوح کی مکمل تفصیل دی گئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنے آباؤ اجداد کے واقعات کو اپنی آئندہ نسلوں کیلئے محفوظ کرتے تھے تا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی غلطیوں سے عبرت حاصل کریں اور ان تجربات سے فائدہ اٹھائیں۔

---

[۱] انتظام کتب خانہ مرتبہ محمد شفیع +

نینوا کا تاریخی شہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ۔ ۔ ۔ سال قبل تباہ کر دیا گیا اور ایک مدت تک نینوا مٹی کے ڈھیروں تلے مدفون رہا اور آخر اس زمانہ میں کھدائی کے وقت یہ عظیم الشان شہر اپنے تباہ شدہ کھنڈرات کی حالت میں نمودار ہوا۔ اور آشور بانی پال کے عظیم الشان کتب خانہ کا علم بھی اسی وقت ہوا جس سے اس زمانہ کے تاریخی واقعات معلوم کرنے میں بڑی مدد ملی۔

یہ بھی خدا تعالیٰ کا ایک بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے انسان کو لکھنے کی قوت عطا فرمائی۔ اگر انسان میں یہ قوت نہ ہوتی تو ہم ان عجیب و غریب کتابوں کے علم سے محروم رہ جاتے اور زمانۂ قدیم کے لوگوں کے محامد و محاسن بھی ان کے ساتھ ہی مدفون ہو جاتے +

نقد و نظر

(بقیہ ص ۳۷)

فراخدلی کا ثبوت دیا۔ کوئی زاویہ کوئی پوز نہ چھوڑا تا کہ کھلاڑیوں کو شکوہ نہ ہے کہ رہ گئے تھے اور فلاں پوز کی تصویر ماری گئی!! ایک نئی روشنی کے حضرت ہیں۔ گو ہماری طرح بیشتر ہی ہیں مگر انہوں نے اپنے وقت کا اکثر حصہ کیمرہ کی زد میں آنے کی کاوش میں صرف کیا!! اسکے باوجود اگر انہیں کوئی تصویر نہ ملے تو تسلائی ان کے ماتم میں شریک ہے۔ مجیب صاحب یا پاشا صاحب کو ان پر ترس کھانا چاہئیے!!

الغرض مبارک علی خان۔ شریف رانا۔ کے محمد خان۔ محمد اکرام۔ وکرٹ۔ الین وغیرہ ایسے کھلاڑی بھی آئے اور رونق دوبالا کر گئے۔ بلکہ اپنی یاد چھوڑ گئے جو انشاء اللہ اگلے سال زیادہ آب و تاب سے تازہ ہو گی۔

ایسے ٹورنامنٹ کرانا ادبیب انتظامی لحاظ سے ایک ٹیڑھی کھیر ہے مگر ان مردانِ خدا کے لئے نہیں جن کا عزم بے آب و گیاہ ویرانوں کو مہکتے ہوئے لالہ زاروں سے بدل سکتا ہے جن کے خلوص میں ڈوبی ہوئی ہمت صحرائی بگولوں کو مشکبار نسیم میں تبدیل کر سکتی ہے۔

اپنا کالج جہاں علوم دینیہ کی طرف توجہ سے اسلام اور ملت بیضا کی خدمت کر رہا ہے ——— اور نظم و ادب (باقی ص ۳۲ پر)

حفاظت احمد
(سائنس)

اعلیٰ حضرت

کردار:- اعلیٰ حضرت ..... میر صاحب
ہم ..... خود مابدولت

(ایک دوست کی مدد سے لکھا گیا)

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ"

"آخر کب تک۔ نا بھائی مجھ سے یہ نہیں دیکھا جائے گا۔ جب دیکھو لکھائی۔ استغفر اللہ۔ سو بار منع کیا کہ بھائی اتنی محنت نہ کیا کرو۔ گھنٹہ دو گھنٹے سہی۔ مگر آپ ہیں کہ کسی کی سنتے ہی نہیں۔ خدا تمہارے باوا جان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ وہی تمہیں سلیمانی لوٹے میں بند کیا کرتے تھے۔ اب تم سے کون سمجھے۔ اچھا بھئی نہ سہی۔ دے لو دکھ۔ لیکن میاں یاد رکھنا۔ اگر صحت کے خراب ہونے پر قرآن کی قسم چاروں کے چاروں طبق روشن نہ ہو گئے تو میرا ذمہ۔"

آتے ہی اعلیٰ حضرت نے نصیحتوں کی بارش شروع کر دی۔ نہ کسی کی سنتے ہیں۔ بس اپنی ہی بیان کئے جاتے ہیں۔ خدا سی غزل لکھنے بیٹھ جاتا ہوں تو بس گویا قیامت ہی آجاتی ہے۔ اور جب غزل ختم کرنے لگوں تو کہتے ہیں کہ جب تک ہم غزل نہ سنیں گے۔ صاحبزادہ صاحب کو باہر نہیں جانے دیں گے۔

آج بھی یہی معاملہ تھا۔ میں نہایت جوش و خروش سے نظم لکھنے میں منہمک تھا کہ اعلیٰ حضرت مدظلہ ٹپک پڑے۔ نہ جانے میرے اعمال خراب تھے۔ یا ان کے اعمال اچھے تھے جو روحانی طور پر مجھے ستانے کے لئے بھیجے تو کیا، گویا نازل کئے گئے تھے۔ ایک دن تو میرے سر ہی ہو گئے۔ ہوا یوں کہ انہی دنوں میں میں رات کے آٹھ یا نو بجے ایک مضمون لکھنے میں مصروف تھا کہ مجھے چھینک آئی تو حضرت بلائے بے درماں بنے یوں حاضر ہوئے جیسے الہ دین نے چراغ رگڑا ہو۔

"اے ہے! صدقے جاؤں۔ کیا ہو گیا میرے نور چشم کو۔ خدا نہ کرے کہیں دشمنوں کی طبیعت تو خراب نہیں؟ مگر کیوں ہونے لگی۔ نا بابا۔ اب بس لیٹ جائیے۔ ہاں! خوب یاد آیا۔ ذرا ٹھہرئے تو۔ میں خود کیوں نہ ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کر دوں۔ ابھی آکر دیکھے جاتا ہے۔ غزل گئی بھاڑ میں۔ ادھر جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور حضرت ہیں کہ لکھے ہی جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ کئی بار منع کیا ہے۔ مگر صاحبزادے ہیں کہ کسی کی سنتے ہی نہیں۔ یا اللہ! بس مجھے اٹھا لے یہاں سے اپنے پیر دستگیر کے طفیل۔ بس اب صبر نہیں ہو سکتا۔"

ہم نے پوچھا کہ آخر بڑے میاں، یہ کیوں؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ! خدارا بس بھی کیجئے، کیا بات ہے، کیا وجہ، آخر کچھ معلوم بھی ہو، نہ جانے دورہ پڑتا ہے اعلیٰ حضرت کو۔ آخر ہوا کیا گیا؟ کہیں میں نے، خدا نہ کرے، آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں دی؟"

"بس جی، اب جانے بھی دیجئے، اس سے بڑھ کر مجھے کیا تکلیف ہو گی کہ خود تو آرام سے رہوں۔ اور آپ کو چھینک آجائے۔ لاحول ولا قوۃ۔"

میں کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا "تو آخر

آنے سے کونسا قلعہ مسمار ہوگیا۔ آخر صحت کی نشانی ہے۔"

وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ فوراً بولے "تمہیں دیکھو تجربہ ہی نہیں ہے۔ آخر ہم نے بھی تو دُنیا دیکھی بھالی ہے، مانا ہے کہ شاعر ہو مگر تجربہ تو تمہارا ہے ہی نہیں، سورج کو چراغ دکھانے سے کیا فائدہ۔ رحمٰن صاحب کو جانتے ہیں، بس نگوڑی سی چھینک آئی تھی اور وہ بھی صرف ایک ہی، پھر کچھ سر کو درد محسوس ہوئی۔ سُستی نے آ دبایا۔ بخار ہوا۔ اور پھر سرسام نے دبوچ لیا۔ تین دن کے اندر ہی اللہ میاں کو سدھار گئے۔ اب کہو؟ اس سے واضح مثال اور کیا ہوگی۔ بھائی دُنیا دیکھی ہے۔ پاپڑ بیلے ہیں پُورے پچپن سال۔ اور تم تو ابھی صرف اکیس سال کے پُرانے ہو۔"

اتنے میں مجھے ایک اور چھینک آ گئی۔ نہ جانے کمبخت نے اسی وقت آنا تھا۔ فوراً نعرۂ حیدری بلند کیا۔ ہینگر (Hanger) سے اچکن اُتاری۔ اور میرے سر پر دے ماری۔ اور کرسی پر سے اُٹھا کر دھم سے پلنگ پر پھینک دیا۔ اور نیچے سے قالین اٹھا کر ہم کو گویا زندہ درگور کر دیا۔ ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا اور میز پر کھڑے ہو کر کانپتی ہوئی ٹانگوں سے آیۃ الکرسی اور یٰسین شریف کی تلاوت شروع کر دی۔

.. ..

آج جب میں نے شعر گھڑنے شروع کیے تو حسبِ معمول آ بیٹھے اور سنانے کی فرمائش کی۔ ہم راضی برضا تھے۔

"تو ہاں بھئی! ذرا چہک کے سُنانا۔ ہاں سُنو تو، شرم نہیں کرنا۔ ذرا تال سُر سے ہو جائے تو اچھا ہے، کیوں، کیسا رہیگا آخر ہماری بھی فرمائش پوری کر دیا کرو۔"

میں نے کہا "معاف فرمائیے گا۔ تال سُر کا تو مجھے پتہ نہیں۔ ہاں سُنائے دیتا ہوں۔ اچھا تو سُنیئے۔ کاوش کی ہے ؎

"تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی وہ ہلکی سی لکیر
میرے تخیل میں رہ رہ کے جھلک اٹھتی ہے"

"واہ واہ! خوب۔ ارے یار بہت ہی خوب، کیا کہہ دیا۔ اُف ظالم، میں تو یقین ہی نہیں کرتا کہ یہ تیرا شعر ہے"۔ ہیں! کیوں، نہیں تو؟ "میرے تخیل میں" کیا نامعقولیت ہے کہیں یہ نہیں۔ نہایت نامناسب۔ بھئی اس شعر کو درست کرو۔ قافیہ ٹھیک نہیں ہے۔ ذرا ٹھہرو تو۔ دالے مرزا کو بھی بلا لوں۔ خوب ذرا رونق ہو جائے گی۔ چلو رہنے دو۔ یونہی تمہاری غلطیاں نکال کر شرمندہ کرے گا۔ تو کیا وہی بڑا آیا ہے غلطیاں نکالنے، ہم جیسے مر گئے۔ ہوں! تو خیر چلیے۔"

ہم نے پہلے جو اپنے شعر کی تعریف سُنی تو بہت خوش ہوئے مگر جب آپ نے ہمارے شعر کا مرثیہ پڑھ دیا تو جل کر بجھ گئے۔ بڑے پیچ و تاب کھائے۔ اور شعر پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا مگر کسی مصلحت سے خاموش ہو رہے۔ آپ اس مصلحت کو خوبی جانتے ہوں گے۔ تو ہم نے کہا کہ شعر ہوا ہے ؎

"یوں اچانک تیرے عارض کا خیال آتا ہے
جیسے ظلمت میں کوئی شمع بھڑک اٹھتی ہے"

ہاں یہ اچھا ہے۔ سُبحان اللہ، عارض، کیا عارض ہے؟ کاش میں بھی شاعر ہوتا۔ ہوتا؟ یعنی کیا معنی؟ تھا! کیوں نہیں تھا۔ پچپن سال لکھنؤ میں گزارے ہیں۔ بڑے بڑے شاعروں کے نرغوں میں رہا ہوں۔ شاعر کیسے نہ ہوتا۔ اس شعر میں تم حُسن نہیں پیدا کر سکے۔ ہاں عارض کی جگہ اگر "زلف" ہوتا تو ذرا حُسن کے ساتھ شانِ استغنائی بھی پیدا ہو سکتی تھی۔ مگر خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ ہیں؟ آپ کو کیا ہوگیا؟ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بیزار بیٹھے ہو۔ آخر وجہ؟

ہم بیزار تو پہلے ہی بیٹھے تھے۔ مگر اب ذرا بزرگ سمجھ کر خاموش ہو رہے۔ اور کہا "کیا؟ یعنی کیا معنی؟ بیزار! میں اور آپ سے بیزار۔ لاحول ولا قوۃ۔ نہیں جی نہیں۔ میں کیوں آپ سے بیزار ہونے لگا۔ آخر شعر ہی تو پڑھ رہا ہوں۔ اگر آپ کی سمع خراشی ہو رہی ہو تو بتا دیجیے گا۔"

جواب ملا "سمع خراشی تو نہیں ہو رہی مگر۔۔۔ ہاں کوئی بات نہیں۔ پڑھتے چلو۔" ہم نے پڑھنا شروع کیا ؎

تیرے پیراہنِ رنگین کی جنوں خیز مہک

"آہا! ہا! خوب! ارے قاتل بہت ہی خوب"۔۔۔۔

"تیرے پیراہنِ رنگیں کی جنوں خیز مہک"۔ ارے ظالم کیا کہہ ڈالا ہے۔ ہاں یہ مصرع وزن پہ اُترا ہے۔ اچھا، تو اگلا مصرع کس طرح ذبح فرمایا ہے، او قاتل!"

مَیں نے پھر پڑھا ؎

تیرے پیراہنِ رنگیں کی جنوں خیز مہک

خواب بن بن کے میرے ذہن میں لہراتی ہے

"خوب! بہت خوب۔ ارے پڑھے جائیے علی الحساب پڑھے جائیے۔ واقعی بھئی واقعی ؎

تیرو آئیں سنے مرشد تجھے مانا بسمل

(ہم بسمل تخلص رکھتے تھے) بھئی کمال ہی کرتے ہیں آپ، ماشاء اللہ۔" "اچھا تو پڑھیئے!" ہم نے عرض کیا "آپ تو ذرہ نوازی فرما رہے ہیں۔ ورنہ خاکسار میں اتنی قابلیت ہے ہی کہاں ۔ ۔ ۔ ۔

وہ بات کاٹ کر بولے "اے ہے! کیا کلمۂ کفر منہ سے نکال دیا۔ نہ بھئی ایسی بات نہ کہا کرو۔ قابلیت تو کیا، قسم خدا کی، اگر ایک بار صرف ایک ہی مصرع مشاعرہ میں پڑھ دو۔ تو لوگ تمہیں تبرک کی طرح بانٹ کھائیں"۔

ہم نے کہا "تو اچھا مقطع ہوا ہے مگر غیر معمولی طور پر ذرا لمبا ہو گیا ہے۔ خیر سنیئے ؎

زندگی ایک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں بسملؔ

خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے"

اعلیٰ حضرت پھر لگے تحسین و آفرین کہنے۔ مَیں نے سمجھا گویا حضرت کو اختلاج ہو گیا ہے۔ آدھ گھنٹے کے بعد چپ ہوئے تو ہم نے کہا "اچھا مولانا! ذرا اپنے زیرِ اہتمام چائے تو بنوا دیجئے"۔ فرمایا "ابھی لیجئے"۔

تھوڑی دیر کے بعد باورچی خانہ سے رعب دار آواز آئی ۔۔

"لا حول ولا قوۃ! ارے باوا۔ اب میرا بھیجا بھی نہیں چھوڑنے کا۔ بس اب دیکھ لی تیری کاریگری۔ دو گھنٹے ہو گئے کہتے کہتے کہ بھئی چائے تیار کر دو۔ اور آپ ہیں کہ ابھی سٹوو بھی نہیں جلایا۔ استغفر اللہ۔ ہاں دیکھنا۔ ذرا چائے کا مزا کسیلا نہ ہو۔ پتی زیادہ ڈالو گے تو کڑوی ہو جائے گی۔ اُبال آنے پر فوراً چھینک اُتار لینا۔ اور دودھ دانی میں ہاف بائل دودھ ڈال لینا۔ سمجھے؟ ہاں، اب مَیں جاتا ہوں۔ ٹرالی میں چائے لیتے آنا۔ سُن لیا؟ ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ورنہ پھر مجھے بلا لینا"۔

نقد و نظر

(بقیہ صفحہ ۳)

ستیلانی تمیں گننے بیٹھے تو کالم سیاہ ہو جائیں گے۔ یہ ساری کتھا کہانی آپ اخباروں کی زبانی سُن چکے ہوں گے۔ وہ بے آب و گیاہ صحرا جہاں گھاس کی پتیوں کا اُگ آنا امرِ محال تھا اور جہاں کی فضا زاغ کی مکروہ آواز کو بھی ترستی تھی ۔۔۔۔ وہاں لہلہاتی ہوئی گھاس پر خیموں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں جن میں ملک کے معروف کھلاڑیوں کے کڑیل جسموں سے بہار آئی ہوئی! میزبانوں کی مہمان نوازی اور مہمانوں کے دوستانہ تعاون اور خلوص سے تین دن خوب گہما گہمی سے بسر ہوئے اور کھیل کا بہترین مظاہرہ ہوا۔ پہلے دن ایک میچ ایسا بھی ہوا جس میں اپنی ٹیم نے شرکت کی۔ محترم خان صاحب تو خیر سرپرست ہیں تبرک کے طور پر دو اساتذہ کرام بھی شریک ہو گئے۔ لوگ چاہتے تھے اب کوئی معجزہ اور کرشمہ ظاہر ہو۔ بھلا تبرک کوئی ایسی چیز ہے کہ اُدھر بھاگتی پھرے۔ بھاگ کر بال کو پکڑنا تو معاذ اللہ تبرک کی شانِ استغنائی کے خلاف ہے۔ ایک محترم تو اس پر کاربند تھے کہ ایک چُپ ہزار کو ہرا دیتی ہے۔ مگر خیریت گزری ایک ہزار پوائنٹ نہیں ہوتے!! ہم اس کے قائل نہیں کہ پہلے میچ میں فلاں موٹا تھا فلاں چھوٹا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات ہوسٹل والوں کو اچھی طرح سمجھ آئے گی۔ ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی!! اگو بعد میں ہم نے تلافی کی۔ مگر بادل دیکھ کر گھڑے پھوڑنے کے عادی ہیں۔ میزبانوں نے معزز مہمانوں کی خوب تواضع کی۔ خاص کر تصویر کش حضرات نے (باقی صفحہ ۳۴ پر)

کے۔ ایس۔ کرشن

دُور کہیں !

"چوتھے سول ڈیفنس کیمپ بورن (مری) میں شمولیت کے بعد ——— داآرا، تجمل، بشیر، گلزار اور بابا عنایت (اساتذہ) کی ولولہ انگیز تقاریر سے متاثر ہو کر ———"

دل میں درد کی لہروں کو بھر
پابندِ تسکین کیا ہے
وقت کا سینہ کھود کے میں نے
یادوں کو رنگین کیا ہے

خوابوں سی مخمور نگاہیں
دُھندلی دُھندلی مدھم مدھم
یاد نگر میں گھوم رہی ہیں
شعلہ شعلہ، شبنم شبنم

دُور کہیں دُھندیائے موسم
لالوں میں رنگین لہُو کی
چھلبل چھلبل کرتی بُوندیں
ہلکورے ہچکولے کھاتی
نیلوں کا مُنہ چُوم رہی ہیں ———

مست البیلے سُندر سپنے
وقت کی مدھم تان میں سرگم
مَن مندر اور کوہ کا دامن
خیمے، کیمپ و دلکش لمحے
جن کی میٹھی یاد سے دل میں
چیخ اُٹھے ہیں ساز کے نغمے

سر بفلک کوہسار اور ٹیلے
نئے نویلے رنگ رنگیلے
دلکش ساکت رنگ کی وادی
جھوم اُٹھے داآرا کی لَے پر
چشموں کے بے باک ترانے
جھرنے کی تانوں سے مل کر
گونج رہے تھے بورن کے 'بن' میں ——— !

داآرا اور تجمل لے کر
قوم و وطن کے راج دلارے
بستی کے ناموس کی خاطر
عزم و عمل کی مشعل لے کر
دُھندلے درپن کو چمکانے
دُور ——— اُسی رنگین فضا میں

مَن میں آس کے دیپ جلائے
گھوم رہے تھے کوہ و دمن میں !
ساتھی ! ٹھہرو شور سا کیا ہے
نالوں میں یہ زور سا کیا ہے
دُور کہیں، سِسکی اُبھری ہے
کس کی آشا سسک رہی ہے
رُوح کے سپنے کانپ رہے ہیں
وقت کے تیور بھانپ رہے ہیں ———

کشمیر مظلوم کی آہیں
بے کس بہنوں کی فریادیں
"آؤ" وادی میں کچھ مائیں
بیٹوں کی راہ دیکھ رہی ہیں ———

قوم کے او ! گھبیر جوانو !
بہن کہیں دل چھوڑ نہ بیٹھے
بیٹی غیرت، لاج کی خاطر
ہستی سے مُنہ موڑ نہ بیٹھے

قوم کے او ! گھبیر جوانو !
دُور نہیں کشمیر کی وادی
داآرا سا گر جوشِ عمل ہو
دُور نہیں گھر کی آزادی
دُور نہیں ——— دُور نہیں !

مہراللہ یار
(فنون)

ایک آواز

ہر تصویر کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک روشن اور دوسرا تاریک۔ روزِ اوّل سے یہ دونوں پہلو اپنی اپنی بہار دکھا کر گلشنِ زمانہ میں خزاں اور بہار کا نام پیدا کر رہے ہیں۔ جب کسی قوم کا عروج شروع ہوتا ہے تو وہ اپنے خوبصورت پھولوں سے دُنیا کا دامن بھر دیتی ہے۔ اس کی خوشبو آفاق کی وسعتوں تک پہنچ جاتی ہے اور ہر سُو دامنِ دہر رنگین پھولوں سے بھر پُور کر دیتی ہے۔ تو عروسانِ چمن اس خوشبو کو باغ سے اُٹھا کر جنگلوں، پہاڑوں اور سمندروں تک لے جاتے ہیں اور ساری کائنات مہک اُٹھتی ہے۔

مگر جب اس قوم کے تمام قیمتی مواد ختم ہو جاتے ہیں اور نونہالوں میں بوجھ اُٹھانے کی طاقت نہیں رہ جاتی تو اس وقت قوم کی حالت اس کشتی کی مانند ہوتی ہے جس میں آہستہ آہستہ پانی پڑ رہا ہو اور وہ وقت دُور نہیں ہوتا جب پانی کی سطح کو خیر باد کہہ کر سمندر کی سطح کو جا لگتی ہے۔ وہ قوم جو تلواروں کے سایہ میں کھیلا کرتی ہے جب مرغ اور شیر سے کھیلنا شروع کر دیتا ہے تو گردشِ زمانہ کی زد سے کسی طرح بھی نہیں بچ سکتی اور اس پر خزاں کے تند و تیز جھونکے کچھ اس طرح سے حملے شروع کر دیتے ہیں کہ آہستہ آہستہ اس قوم کے کھنڈرات ہی اس کی یاد میں رہ جاتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ عرب کے بدو صحرائے عرب سے اُٹھ کر ایران اور روم پر چھا گئے۔ ان کی تلوار مغرور سروں کو سجدوں میں ملاتی ہوئی اندلس پر جا منڈلائی۔ وہ طوفان جو عرب سے اٹھا تھا ہندوستان کو بھی اپنی زد میں لے گیا اور مسلمانوں کی عظمت کو دُنیا کے کونوں تک پہنچا دیا۔ اور اسلام کے بہادروں نے اپنے مذہب کی خاطر اپنی جانیں اس طرح پیش کیں کہ دُنیا حیران رہ گئی۔

یہ سب کچھ کرنے والے وہ مجاہد تھے جن کے نام آج بھی درخشاں ہیں اور مسلمان اپنے مایۂ ناز جرنیلوں پر فخر کر سکتے ہیں۔

لیکن کیا آج ہم اپنی حالت بہتر نہیں بنا سکتے؟ کیا آج ہمارے پاس پہلے جیسے جرنیلوں کی کمی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

اب بھی ہماری قوم خالد پیدا کر سکتی ہے۔ اگر ہمارے دل میں اسلام کی محبت ہے تو ہر مسلمان خالد بن سکتا ہے۔ آئیے ایک بار پھر دنیا کو خالد کا دیدار کرا دیں۔

ہر ماں اپنے دامن کو خوبصورت ہیروں سے بھر سکتی ہے جن کی چمک دنیا کو روشن کر دیتی ہے اور محمد بن قاسم جیسے فرمانبردار بچوں سے محروم نہیں رہ سکتی بشرطیکہ وہ اپنے بچوں کو دیو اور بھوت کی کہانی سنانے کی بجائے طارق اور موسیٰ کی کہانیاں سنائے تاکہ اسکے بچے اپنے ملک کی باگ ڈور سنبھال سکیں۔

ہر باپ کے گھر فتح علی ٹیپو پیدا ہو سکتا ہے اگر وہ اپنے فرزند کو غیرت کی شراب پلا کر اس کے دل میں جذبۂ حُریت بھر دے۔ یاد رکھیے قوموں کی تقدیر گفتار سے نہیں بلکہ کردار سے بدلتی ہے۔!

اب وہ وقت گزر گیا ہے جب انسان فرعون کے مظالم سے تنگ آ کر اسے سجدہ کرتا تھا یا نمرود کے جاہ و جلال کو دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگتا تھا اب آپ کا قدم اس دُنیا میں ہے کہ جس میں آپ جو کچھ چاہیں بن سکتے ہیں۔ آپ بھی قوم نادر کے نادر بن سکتے ہیں مگر محنت شرط ہے!!

نقد و نظر —— (بقیہ ص)

سونگھتے پھرتے ہیں۔ لاہور اس کا ذخیرہ میں سب سے آگے آگے ہے —— "نہیں ریساں شہر لاہور دیاں" —— !! وہاں احمدیہ انٹر کالجیٹ ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام ایک مباحثہ ہوا جس میں منور احمد صاحب نے حصہ لیا۔ نیم گھاگھ مقرر تو نہیں مگر ہیں بڑے ہی —— اوّل انعام کے ساتھ لوٹے —— گورنمنٹ کالج سرگودھا میں بھی سیکنڈری بورڈ زونل مباحثہ ہوا۔ قارئین کو شاید یاد نہ ہو کہ سال گزشتہ میں بھی اپنے کالج نے چیمپین شپ جیتی تھی مگر اب کے امکان نہ تھا کیونکہ پرانے گھاگھ مقرر تو بکھر چکے ہیں۔ کوئی پنجاب یونیورسٹی میں بیٹھا ہے تو کوئی لاء کالج میں —— گو نئی پود تھی مگر پھر بھی روایت برقرار رہی۔ اکمل ثوری جن کے اندازِ بیان کا تذکرہ سیلانی اوپر کر چکا ہے، سرگودھا گئے۔ محمود۔ ایس۔ کوثر آپ کے ہمراہ تھے۔ اکمل اوّل اور محمود چہارم رہے اور چیمپین شپ کالج کے ہاتھ رہی۔ آغاز تو نیک ہی ہوا ہے۔ توقع ہے کہ انجام بھی بخیر ہی ہو۔ کیونکہ مقرروں کی کھیپ دساور جانے کو تیار ہے !!

○ **باسکٹ بال ٹورنامنٹ:** حال ہی میں اپنے کالج کی باسکٹ بال ٹیم نے ایک زرّیں کارنامہ سرانجام دیا ہے یعنی اپنے زیرِ اہتمام اس علاقہ میں آل پاکستان کی بنیاد پر اپنی نوعیت کا پہلا باسکٹ بال ٹورنامنٹ منعقد کروایا۔ اپنا کالج ایسی ٹھوس سرگرمیوں میں یوں تو کسی کالج سے پیچھے نہیں مگر جو کام کرتا ہے وہ پائے کا ہوتا ہے۔ مباحثے ہوں یا ایسے ٹورنامنٹ —— اپنی نظیر آپ ہی ہوتے ہیں۔ سنجیدگی، تنظیم اور ماحول کی مثال لانا مشکل ہے۔ اپنی ٹیم کچھ ایسی ناکارہ تو نہیں کہ ناک بھوں چڑھائیں۔
مگر جو مال دساور سے آیا تھا اس کے کیا کہنے۔ اب کے تو حد ہی ہو گئی۔ پاکستان باسکٹ بال کے اکثر معروف کھلاڑیوں کی آمد سے خوب رونق ہو گئی۔ کہیں سے "مسٹر پاکستان" بھی آ موجود ہوئے۔ صرف تصویروں کی زبانی ہی جانتے تھے، آنکھوں دیکھ لیا۔ انہوں نے بھی اپنے فن کا قابلِ داد مظاہرہ کیا۔ (باقی ص ۳۷ پر)

لطف الرحمٰن محمود

غزل

آج تو جگمگا گئی منزل
دیکھیے داغِ دل کی تابانی !

اب بگولے بھی ناز کرتے ہیں
رشکِ صحرا ہے گھر کی ویرانی !

کھل گئے آگہی کے تنکے بھی
اُن نگاہوں کی برق سامانی !

ایک دل تھا نہ ہو سکا جو موم
سخت پتھر بھی ہو گئے پانی !

واعظوں کو بھی سرنگوں دیکھا
خوب تھی میکدے کی دربانی !

اپنی قسمت کہ غیر لگتی ہے،
وہ جو صورت تھی جانی پہچانی !

AL-MANAR

CONTENTS

			Page
1.	Editorial	Rashid Ahmad ...	1
2.	Shakespeare's Idea of the Origin of Sin	Salim A. Siddiqui ...	3
3.	Poem	Abu Bakar III Yr ...	5
4.	Painfully Sorry	Sazom IV Yr ...	6
5.	On Noses	Rashid Ahmad ...	7
6.	Poem	Hadi Moonis. IV Yr ...	10
7.	Reflections on Scientific Progress	Ijazur Rahman Demonstrator in Physics ...	11
8.	Rader	Mohd Afzal Malik IV Yr ...	14
9.	Kenya	Ajmal Ghauri ...	15

Printed by S. A. Rashid, Managing Proprietor, The Lion Press, Hospital Road, Lahore
and published by A. R. Junaid Hashmi, from Talim-ul-Islam College, Rabwah, West Pakistan
Prof. Incharge: M. A. Choudhri.

EDITORIAL

BY

RASHID AHMAD

Nothing has more stemmed the tide of learning in our Alma than the deliberate indulgence of our young students in idle pursuits, in dissipation and in imprudent negligence of their studies. Far, far into the evenings and long, long into the mornings they are seen roving aimlessly or ticking off their price less time in company of pedantic vagabonds. They derive a species of vagabondish, naughty pleasure when they chance to be in a cafe, or in the college tuck-shop, sipping hot tea and puffing hard at cigarettes. It is a treat to watch these young vain wanderers engaged in their fits of merry-making, best expressed in making grimaces at each other, or distorting the faces, seeing which would make a matron miscarry.

If this sad state of affairs continues, we shall miserably fail to achieve fulfilment of the great aspirations, great ambitions and great hopes which our elders have of us.

Friends, life is not what we see. It is something deep. Life is not to quench our thirst with water, to extinguish our appetite with bread, to rest our eyes with sleep, to fill our ears with melodious strains of music, to walk amid flowers in rapt delight, or to hurriedly bear ourselves to dust, the bourne of us all.

But life is an intricate labyrinth which each one of us has to thread with utmost care and sagacity. There are scattered thorns which we have to remove and not let ourselves be pricked and bled by them; there are impediments and obstacles which we have to clear and not stumble over them; there are times when we fall and wish others to prop us, but we have to prop ourselves while falling and not when fallen; there are dreams which are delicious to cherish, but we start when hard facts brace us.

Then how can we best clear this labyrinth without being lost in it? The answer is what the ancient, the medieval and the recent saints and sages have given. That is, for the successful passage of our lives, for the sublimation and orientation of our lives, we have to tend and train ourselves to inculcate in us a spirit of self-

abnegation, of moderation of our desires, and of subjugation of our passion. Death should have no terror in our lives.

To make our life a success we need knowledge and courage to know ourselves and our surroundings. Fortunate as we are, we are drinking deep at the fountain of knowledge being imparted to us by our dear Alma.

Let us extol and glorify our Alma, by brilliantly orating from the rostrums of others' stages and those of ours; let us raise sky-high the prestige of our Alma in the comity of our educational institutions, by winning distinctions and colours in our academic and sports careers; let us beautify our Alma by beautifying our distinct marks and essential features that constitute a fascinating personality; and let us lay its foundations deep and raise its walls high, so that the chime of its glory may resound to all and down to the postery in times to come.

"Shakespeare's Idea of the Origin of Sin ?"

BY

SALEEM A. SIDDIQUI, III YEAR.

Nobody would gainsay the fact that the origin of sin is a controversial issue. It is really very difficult to find a comprehensive inductive or deductive method for determining the factors which give birth to sin. To err, it seems, has been riveted firmly in the nature of man from the very beginning. The story of Adam and Eve is ample proof, and can be presented as a living testimony in this respect. There are numerous factors which lead the human race to commit sin and whose end is quite clear, that is, destruction in all respects. In case of Shakespeare we have to see very closely the cause which he has put forth as the origin of sin in the light of his tragic drama *Macbeth*.

It will be very beneficial if the meaning of sin is clear to us, because the matter will be more elucidated. Sin, according to the dictionary, is 'wilful violation of law'.

A close study of the drama will reveal the factor which led Macbeth to violate, the law despite knowing the ends of his action. When we go through the drama we see that events go on taking place in such a manner that Macbeth, despite knowing the end of his ambitions, is bound to commit the sin, namely, the murder of King Duncan. There is no reaction in the absence of action. An intimate study of the drama shall tell us that the idea to murder Duncan for the attainment of power is not new. Predictions by witches and the bold encouragement of his wife cemented his ideas and ambitions, opportunities went on accumulating in such a way that he could not resist his vicious intentions. In this connection Lady Macbeth played a very important role. *Macbeth* points out to a particular kind of sin—the sin that results from the lust for power. The action moves directly and quickly to the crisis, and from the crisis to the full working out of plot and theme. It is certainly not an abstract formulation, but lies in drawing out the necessary implications and consequences of that lust both in the internal and external worlds of man. The idea is not formal but experimental and demands from us a fulness of imaginative response and closeness of realization as Mr. Boris Ford has pointed out.

In the great soliloquy, Macbeth tries to provide himself with prudential reasons for not committing murder :

> But in these cases
> We still have judgement here; that we but teach
> Bloody instruction, which being taught return,
> To plague th' inventor.

But the taunts of his wife leave no way for escape. Macbeth could escape if the idea to sin were not present in his mind. Lust for power was so intense in his mind that he could not resist it. The conflict of good and evil thoughts in his mind was so enormous that he could not keep balance of mind. The murder of King Duncan was the turning point in the life of Macbeth, after which he was quite a changed man.

In this connection we cannot eliminate the part played by Lady Macbeth. She descends from Eve—a weaker vessel and an easy target of evil spirits. She seems to be very enthusiastic in her lust for power. She helps, encourages and consoles the mind of Macbeth who falls an easy prey to her. It shall be very beneficial if I quote Kenneth Muir in this connection. He says, "In the drama we can clearly see a picture of a special battle in a universal war, and the battle ground is the souls of Macbeth and his wife". I see a similarity in the roles played by Eve and her daughter Lady Macbeth. Evil came to Macbeth and awakened that sleeping thought through Lady Macbeth and the three witches.

Macbeth is aware of evil from the very beginning. He admits that its " horrid image " makes his hair stand on end and his heart knock against his ribs. But, on the other hand, Lady Macbeth deliberately chooses evil. She invokes, not metaphorically, but quite in earnest, the Powers of Darkness to take possession of her. There is a vast difference in the mode of thinking between the two, *i.e.*, Macbeth and Lady Macbeth.

From the above mentioned facts we can very easily come to the conclusion that, according to Shakespeare, in the light of the drama under discussion, the origin of sin is in simple words 'lust for power.' In this connection the weaker vessel plays a stronger role. I do not feel reluctant in declaring that Lady Macbeth is an embodiment of evil spirits or, rather I should say, that, according to Shakespeare, woman is a living reflection of evil spirits. The fair sex, in his opinion, nourishes the sin and evil thought to such an extent that it seems as if women were the origin of sin. To conclude, the origin of sin, according to Shakespeare, is lust for power, and the most predominant part played is by a woman, who, according to him, is an embodiment of evil spirits in herself.

Somnambulance

BY

ABU-BAKAR, III YEAR.

Alone am I in the fields
Crying in the wilderness for thee
Will my supplications find sooths
In that dreary heart of thee ?

The whole earth is a desolate arena
The sweet slumber of the night is no more
Still I linger amidst the mournful panorama,
But the cheerful amateurs are no more.

Oh ye moon and stars veil your gleams
The cold breeze of the morning cease
I faint with griefs
I search thy shadow on the leas.

But no more I find thee
The sweet dream is over,
I rise but I behold not thee
And toss in the cot over and over.

PAINFULLY SORRY

BY

SASOM, IV Year

A number of Fourth and Second Year students are now-a-days suffering from cold and cough, others from indigestion and still all the more worse from sleeplessness. Frequent consumption of artificial ghee in our messes, scarcity of fowls for the production of eggs, and heaven knows what, were mistakably resorted to as the final cause. But thanks to our worthy dispenser who has heroically rushed to the scene and solved the enigma. According to eye-witnesses, he started a series of late night rounds and discovered to his credit that the majority of patients were of the Second and Fourth species of the college flocks Upon close examination a frustrated Second Year student uttered the following words while fast asleep :—

"Koi kisi ki nind chorata hai or maze se khud so jata hai."

Yet another Fourth Year pupil by his side groaned, "Wee m I detned, wad?" Our great wit (indeed, he deserves that expression), by filling in the gaps rightly asserted that the torture-expressing words pictured by that tortured mind were, "Why am I detained, bad?" In short our doctor came to the conclusion that there exists another kind of harmful bacteria (Habukhanic) causing a momentary disease which he names as (Habukhanic Detentionic) which causes cough, indigestion and sleeplessness at different stages of temperature. I trust the world of medicine would hail this great discovery amid thanks and congratulations.

So far as the presence of that bacteria is concerned, I confess I reasonably feel it, but I very much doubt whether such a thing could ever be momentary. We have still a couple of days for the detention list to be notified, but the stress and strain upon my already weak marks are so tremendous that I sometimes find myself almost paralysed and have no reason to doubt why my comrades shouldn't feel the same.

It is extremely painful that our Privy Council forgets, or at least pretends to forget, that we are undoubtedly made of the same stuff, and feel and respond in like manner. If one is an examiner today, he should remember he has been an examinee just yesterday, and if one dreaded being is murdered why should he dream of murdering others ?

In the end any disparaging phrase is REGRETTED with capital letters and shouldn't be taken deeply to heart.

On Noses

BY

RASHID AHMAD

As our organs of smell and the touchstones of our facial beauty, noses have an important part to play in our physical assets. They have an appeal to the aesthetic taste of a student of the philosophy of fine arts. A sculptor finds himself embarrassed when he comes round to chisel the nose of a statue. A painter's forehead sweats when he begins to paint the nose of his portrait.

Happily, nosed as we are, almost all of us, an attempt to delineate a variety of noses will be desirable.

Now noses are differently sized and shaped. There are, to begin with, aquiline noses and snub noses; bottle-shaped noses and crooked noses; high noses and low noses. Aquiline nose or Roman nose is one which is prominent and beautiful. The Roman nose of St. John in Bronte's *Jane Eyre*' is in my opinion (it may not be authentic) the ideal one for the sterner sex; that of Miss Ingram's in the same popular classic is ideally held precious by young girls. For those women, not much advanced in age, cherry-type nose (red and swollen) of Dickens' immortal creation, Mrs. Gamp, is honestly suggested.

Noses are rigid and tanned. Noses are delicate and flexible and experience shows, indifferent to the tyranny of petrifying cold. Neither do they quail in sweltering heat. In fact owners of rigid noses have an advantage over owners of delicate ones. The skin of delicate noses is finely textured. If we chance to view a delicate nose, standing close to the possessor, we will see that such a nose gives off a species of radiance. Nostrils of frail noses, particularly those of the fair sex, are always highly praised by the story-writers of the modern light. They have been exaggeratedly likened to the two petals of a half-opened lotus-flower. Such nostrils dilate when their possessors are incensed, or when they are, in a jovial mood, inhaling fragrance in a rose-ful garden. But there is much ado

in the up-keep of delicate noses. For instance, they congeal in December and have to be blown out time and again. It is a pity that there is no such nose-bag for us as there is one for our pets. In this respect the canine race has an advantage over the human race. What a contrast. !

Noses have also a say in our voices ; it is so only in a few cases. Some people have nasal twangs, that is, they seem to speak through the nose. To many a lover of music, with a singing turn of mind, a voice blended with a nasal twang is extremely edifying. Instance is Mukesh, an eminent play-back singer of India. We also sometimes like a preacher's twang ; sometimes we want to fire at such a person.

A tear of sympathy stands in our eyes when we come across people with ugly or deformed noses. They weep over their absolute inability to change their noses and mould them after cherished desires—a longing. They wistfully behold those who are blessed with beautiful noses Those with ugly noses nurse a feeling of inferiority complex. They feel their physical composition is defective, rather incomplete. This conscience-smiting feeling is more conspicuous in ladies than in gentlemen. They veil their noses and try to attract attention with the charm of their eyes, if they are possessed of any. But I sincerely advise the dejected not to feel low and trodden. I may infuse hope in them by making an allusion to the plastic surgery of noses that is solely carried on in Japan. Hundreds of thousands of noses have been successfully operated upon and removed of their irregular projections. Those whose pocket permits may leave for Japan by air, and return, to the feeling-pleasure of friends and relations, home with corrected noses.

In the Shakespearean era particularly and in sub-sequent times generally, noses were made a vehicle for mimicry in pantomime which means acting in a dumb show. Noses were waxed heavily in order to make them prominently high and thus provide an occasion of inextinguishable laughter for the onlookers.

Now something about the uses of noses,. Untidy urchins' noses usually flow. School teachers, particularly those imparting education to the younger generation, make use of the nose in a novel but funny way. When they intend to inflict chastisement upon the delinquent, they catch hold of the tip of the nose with the left hand and conveniently slap the face with the right hand. Noses provide a cosy station to place our glasses on. Keats's nose must have been very sensitive when he saw and

smelt the roses round the corner and exclaimed in ecstasy : 'A thing of beauty is a joy for ever.' Passing through a dirty lane, it is our noses that excite our faculty of smelling, and we, becoming at once aware of a nauseating odour, cover them with our handkerchiefs. We feel spiritually elated when we inhale wafts of sweet fragrance through our noses. Having so many uses of noses at our disposal I, for one, love my nose passionately.

A word with the nose-less. They should pride themselves upon having been relieved of an unnecessary burden from their faces. But if they are genuinely sorrowful, we too feel mournful for them and as a mark of our sharing their deep sorrow, we wear the black crepe.

Finally, I ask those who possess this most wonderful gift of God, ever bestowed upon man, to raise our hands to heaven and thank Him. Verily He created us in the best state. For Him, the nosed and the nose-less are alike.

FIRST TRIAL

BY

M. HADI MOONIS

Boast not of your beauty now
Dear, you are full of beauty though.
I love thee. Oh, kill me not
Who is in the fisherman's trap caught.

Come near - that heart may see
Freely you have loved me.
—Don't be shy ;
Come ! Come ! Fly ! Fly !

But no, no ;
Time is passed, hour has run ;
And—
Winner has won game so oddly begun.

Reflections On Scientific Progress

BY

IJAZUR RAHMAN, B.SC., DEMONSTRATOR
IN PHYSICS

We have heard nothing more about the adventures of Lunik rocketed into space by Russian scientists, which was claimed to be on its way to the sun's orbit. As far as I believe the poor thing got unbalanced and returned to the mother planet or went too near the sun to retain its original physical state and thus melted in space. Since then no fresh attempt has been made by either side. Preparations, however, might be going on in both camps to prove one's superiority over the other and some day we may hear of another satellite visiting the ethereal kingdom.

The tug-of-war between the two well-known blocks of the world has no doubt assumed a less destructive shape now, since the scene of the battle where the combatants are fighting their duel is thousands of miles away from us. The inventions of ever-new atomic bombs has been suspended and their bubbling energies have been directed towards another outlet for its flow. But, unfortunately, the production of deadly weapons has not altogether stopped. Recently it was heard that a new bomb, more destructive than the Cobalt bomb, was invented which could annihilate life faster than could any atomic bomb. And I shudder to think what more horrors science has in store for the already suffering humanity.

The extreme usefulness and indispensability of science cannot be denied and it was thought many years ago that in it alone lay the redemption of mankind. But the illusion is now too obvious to be deceptive. We are now-a-days not in a mood to believe that science always will do us good. I cannot name a single invention made by science which is not fraught with the most horrible dangers. Take the case of an aeroplane. It was the achievement of a very old desire of man to see himself gliding like winged birds in the air. But we can't deny that it has caused a terrible loss of human life and property both in war-time and in peace. Its merits are only too insignificant when compared with the vast destruction caused by it. Was it not an aeroplane that carried the first atomic-bomb ever

to be dropped on hundreds of thousands of innocent and ignorant human beings who were levelled to the ground in no time ; and many valuable lives have been lost in crashes so frequent in the last five years. Take any other invention, count its merits and demerits and you will agree with me that science so far has done more harm than good.

I do not denounce science altogether, for may own occupation is the same and it is through its knowledge and study alone that I am profiting so much. To me science means acquirement of all kinds of knowledge through observation and contemplation. The mysteries contained in the objects of nature all round invite us to apply ourselves to a task we call Research. Much can be, and has been, gained through it. But the knowledge which is gained thereby can be employed for a good or a harmful purpose. And it is at this stage that the research-worker should be more than a mere scientist or a calculating mathematician.

It is said that, "Necessity is the mother of invention." Now, evidently, at the present time, when the majority of the population in all the countries of the world (save one or two) is threatened with disease and starvation, with floods and epidemics is it not highly imperative that scientists should pay most devoted attention to finding out ways and means of rescuing humanity from these menaces? Out of these, scarcity of food is the most important. With growing populations, which bid fair to get doubled before long, the already available quantity of wheat and other cereals is not at all likely to multiply, so as to be sufficient for all of us. In our country, since the partition, population has increased enormously, but production, on the other hand, has either definitely decreased or not at all increased. This problem lends itself to be tackled in two ways, one of which is not very likely to be considered by any of us. The other which is concerned with increasing the production is, therefore, the only way out.

Let the scientist and the student of science today take it upon himself as a duty to make researches in the field of agriculture : find out methods of checking and enhancing yield per acre and so on. This will be indeed a noble task and the inventions and discoveries made therefrom shall never be used in any way other than for the betterment of mankind.

Our present Government has very prudently foreseen the utmost necessity of effecting the agrarian reforms long meditated. This will provide more facilities for the experimenter.

What I emphasise is that science should be used in the service of mankind and not for effacing it from the surface of the earth.

It is true that production of weapons is also made imperative by need—the need of defending one's country and preserving its integrity and economy. But why are countries worried by aggressors at all? Again, the cause will be found to be the same—want. The days when ambitious emperors used to conquer country after country to add to their empire only for the pleasure of enjoying victories are gone. Now-a-days, if a country has evil designs against some other, it is because the economy of the former is in some way dependent upon the other or is likely to improve if it gets hold of the latter. The root cause of wars now-a-days is therefore poverty or want. These causes which are so threatening to the world of today can only be removed if they are scientifically dealt with. Science can lend immense help for solving material problems and it is strange why use has not so for been made of it in this respect.

RADAR

BY

MOHD AFZAL MALIK, IV YEAR

No one can deny the fact that science has progressed by leaps and bounds after the second War. Many wonderful and important things have been discovered in this age. As nations were in need of many things, due to war, so science afforded the chances for new useful inventions. Radar is an invention of war-time. It helped nations to defend themselves against the attacks of enemy aeroplanes, ships submarines, etc.

Principle : The word 'Radar' is an abbreviation of the words 'Radio detection and ranging' which means ranging of an object using radio waves. Its principle is similar to the principle of sound echo or wave reflection. When a man cries in front of a high building or a hill he hears a similar voice in the form of an echo. As a matter of fact, when a man cries waves are produced in the air which strike the building and come back after reflection. As time is spent when waves go forward and come back, so the echo is heard after some time. This time depends on the distance from the building or the hill and velocity of sound. Applying this principle we can easily know the height, direction of building can be determined by measuring the time between original sound and the loudest echo. Half the time, multiplied with the velocity of sound, gives the distance of the building.

In order to find the height of a building parallel waves of sound are sent towards the building through a transmitter. Waves will strike the building and will come back. When the wave will cross the top of the building then no reflection will take place, so no waves will be received in the receiver. Transmitter and receiver are adjusted to make such an angle that no waves are received in the receiver. This angle is determined. From this angle we calculate the height of the building with the help of Trigonometry.

Now, suppose the building is covered with fog and we do not know its exact position. By directing sharp, short sounds at various angles, the direction of the hill can be determined by noting the direction which gives the loudest echo.

Radar works on this principle, difference being that here radio-waves are used instead of sound waves. Its transmitter is similar to a radio transmitter but its receiver receives only those waves which are sent by the transmitter. We know that velocity of sound waves is 1100 ft per second but the velocity of radio waves is 186000 miles per second, so radio waves are very useful in giving information about distant things. As the velocity of radio waves is great, so the time for the journey of radio waves to the reflecting object and back to the receiver is very small. For measuring such a small time, an instrument 'Oscilloscope' is used which can measure a millionth part of a second. Oscilloscope is marked with miles and angles which help us in knowing the distance and direction respectively.

Radar equipment consists of :

1. Transmitter 2. Aerial 3. Receiver.

1. *Transmitter :* It is designed to produce radio waves of very high frequency and of very small wave length, duration of radio waves being short.

2. *Aerial :* It is short and highly directional so that it sends the waves in one direction only.

3. *Receiver :* It is a short-wave receiver having the least possible noise figure. It measures the time taken by the waves in their journey in going to, and coming back from, the invisible object.

Uses : Radar was used in the second World War to detect and determine the distance and direction of enemy aeroplanes and ships. It tells the approach of enemy planes before they can be seen.

Radar detects submarines and icebergs invisible due to distance. It has been used to guide aeroplanes in their flight and aiding them in landing under conditions of poor visibility. The operator of radar equipment at an air-port learns the location of an approaching aeroplane before it arrives at the airport. When the weather is not good, the operator guides the pilot all the way to the field with the help of radar. In 1946, U. S. Signal Corps also used radar equipment to measure the velocity of sound in vacuum. It has been used to find the height of the ionosphere by Appleton,

Kenya—The Land of Variety

BY

AJMAL GHAURI

Kenya is a land of varied culture. Besides the natives, Europeans. Asians, Americans and Arabs dominate. This combination of different races lends a gorgeous life to the country. So far as wild life goes, Kenya is second to none.

It lies on the Eastern Coast of Africa. Towards the North we have Ethiopia as our neighbour, Tanganika on the South, Uganda on the West, and the rumbling Atlantic foams along the East. The Equator passes through the centre. Climate is pleasant all over except in the drier parts. Contrary to the general belief, some parts of Kenya are extremely cold ; places like Man Summit have a very low range of temperature. Green pastures, rumbling rivers, calm lakes and lofty mountains are the natural features of this land. The whole country, for the most part is a plateau ranging from 3000 to 10,000 feet.

Now let us see the sort of government we have. It is a colony of Britain and protected by the British. The Governor, who comes from the Foreign Secretary's office, is responsible for the order and progress of the country. The Governor is assisted by a Legislative Council. The members of this Council are elected every four years by the general public. Being a cosmopolitan country, every community has its own elected representative in the Council. There is complete freedom of thought, speech, religion and education. In short we have quite a democratic sort of Government.

The system of education is based on the fundamental need of every citizen ; and is very efficient as well as sensible. There is one "Ministry of Education" responsible for the uplift of the country, educationally and morally.

Education becomes necessary from the age of four years for either sex. The children are sent to a nursery school, where such elementary knowledge as counting, etc., is gained. Sufficient physical and mental exercises together with proper nourishment are other salient features of the nursery school.

At the age of six, i.e., when the child has spent two years in the nursery, he is admitted to the primary school, where he stays for seven years. The primary school leads to Kenya Preliminary Eximination, after which a child can join the Secondary School.

The Secondary Education provides with School Leaving Certificate of the Cambridge University (Senior Cambridge). Here you have the option of taking the English language and any other five subjects. For higher studies one has to go to foreign lands ; this is because we don't have sufficient professional colleges at home. Mostly it is co-education that can be found in different institutions, but Muslim girls have Muslim Girls' Schools, where purdhah can be observed as no male teachers are employed.

There are some very strange and quixotic traditions prevailing among some Africans. Their new-fangled notions might be a novelty for the reader.

There is a certain group of people called Masai. This is a tribe of warriors ; and these creatures are as immune to civilization as ever. The interesting thing about them is that the braves seldom take a bath. They believe that bathing would kill their fighting spirit making them meek and chaste. Another interesting aspect of the traditions kept by them is regarding marriage. It is absolutely essential for a brave to kill a lion all by himself with his primitive spear. The skin of the lion is presented to the bride as the bridal dress, while the meat is eaten by friends in a special gathering to celebrate the auspicious festivity.

Very few pygmies are in Kenya. An adult male of this tribe stands only four feet from the ground. They usually wear leaves. Their favourite dish is monkey, though ants, lizards, etc., are not bad to their taste. They are primitve and illiterate. But good hunters they are. They have a strange way of killing an elephant. Taking the wind direction they sit under the gigantic belly and pierce it through with a poisnous arrow. Risky, isn't it?

Our national heritage is the wild-life of Kenya. It is the only country in the world where all types of wild life still survive. Rhinoes, elephants, lions, zebras, giraffes are in abundance. These animals attract thousands of tourists from all parts of the world every year. The tourist industry helps a lot towards a better economic condition of the country. Tourists come for shooting—mostly with cameras. Large areas have been reserved for animals ; here shooting by gun is strictly prohibited. These are known as the Royal National Parks. One can go in a car and see these animals from a very close range. This is certainly more interesting than a zoo: for in a zoo the animals are caged, physically weak and slavish in behaviour, but in the National Parks animals are as free and strong as could be.

How about a visit to this land of variety ?